فہرست

شذرات	اہل دعوت کا مسئلہ	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۶۱-۲۶۴)	جاوید احمد غامدی	۵
معارفِ نبوی	اوقات نماز	زاویۂ فراہی	۹
	تقدیر کی تفصیل	طالب محسن	۱۲
دین و دانش	قانون عبادات (۴)	جاوید احمد غامدی	۱۵
	قانون سیاست		۲۰
حالات و وقائع	ارض فلسطین پر یہود کا حق	محمد عمار خان ناصر	۴۷
	دنیا پرستی (۱)	ریحان احمد یوسفی	۶۰
وفیات	بندۂ مومن کی رحلت	محمد بلال	۶۵
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اہل دعوت کا مسئلہ

ہمارے اہل دعوت کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دین کو اس کی کامل صورت میں پیش کرنے سے گریزاں ہیں۔ اس کے برعکس وہ اجزاے دین کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ عامۃ الناس کسی ایک جز کو مکمل دین تصور کرنے لگتے ہیں۔ ان کے طرز عمل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دعوت، جہاد یا کسی دوسرے جز و دین کو مخصوص زاویۂ نظر کے تناظر میں مرکز ومحور بنایا جاتا ہے اور پھر فکر وعمل اور دعوت و تربیت کی تمام سرگرمیاں اس سے وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ علم و تحقیق کا کام اسی خاص جز کی تفصیل جاننے کے لیے کیا جاتا ہے، تصانیف اسی کی وضاحت کے لیے تالیف ہوتی ہیں، رسائل اسی کے ابلاغ کے لیے جاری ہوتے ہیں، درس گاہیں اسی کی تعلیم کے لیے قائم کی جاتی ہیں، جماعتیں اور تحریکیں اسی کے بارے میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے منظّم ہوتی ہیں، غرضیکہ دعوت کے تمام مظاہر اسی جز کی تفصیل کر رہے ہوتے ہیں۔ دین کے باقی اجزا کو اول تو بیان ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کبھی ضرورت پیش آ جائے تو اس خاص جز کے لوازم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

دعوت، دین کا ایک جز ہے، مگر بعض اہل علم نے اسے اس طریقے سے پیش کیا ہے کہ یہ جز دین کے پورے وجود پر حاوی محسوس ہوتا ہے۔ ہر خاص و عام کو کار دعوت کا مکلّف قرار دیا جاتا ہے۔ مگر ہر شخص، ظاہر ہے کہ اس کی صلاحیت اور استطاعت نہیں رکھتا کہ قرآن، سنت، حدیث اور فقہ کے علوم پر دسترس حاصل کر سکے اور انھیں تدریس، تقریر یا تحریر کے پیرائے میں لوگوں کے مختلف طبقات تک پہنچا سکے۔ چنانچہ دین کے مشمولات میں سے چند نکات پر دعوت دین کا عنوان قائم کر کے انھیں ہر کس و ناکس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کی سب سے نمایاں مثال تبلیغی جماعت کا کام ہے۔ ان کی دعوت چھ نکات پر مبنی ہے۔ ان میں سے 'تصحیح کلمہ' سے مراد الفاظ کو صحت کے ساتھ زبان سے ادا کرنا ہے، 'تصحیح نماز' سے

مراد کلمات نماز کو یاد کرنا ہے، 'تصحیح علم و ذکر' سے مراد فضائل کا مذاکرہ اور کلمات ذکر یاد کرنا ہے، 'تصحیح نیت' سے مراد چھ نکاتی پروگرام کی تبلیغ کے لیے نیت کرنا ہے، 'اکرام مسلم' سے مراد مسلمانوں کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آنا ہے اور 'تفریغ وقت' سے مراد متعین ایام کے لیے چھ نکات کی دعوت لے کر لوگوں کے پاس جانا ہے۔ یہ اجزا اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں، مگر انھیں اس طرح پیش کرنا کہ یہ دین کی کلی دعوت قرار پائیں، دین کے لیے فائدے کے بجائے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

بعض علما جہاد کو دین کے اصل پیغام کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دین کے اس جز کو وہ اس طریقے سے سامنے لاتے ہیں کہ ہر شخص جہاد و قتال ہی کو مکمل دین تصور کرنے لگتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ دین کی بقا اور تبلیغ و اشاعت اسی صورت میں ممکن ہے، جب دشمنان اسلام کے خلاف برسر پیکار رہا جائے۔ اس راہ میں اگر دنیوی منزل نہ بھی حاصل ہو، تب بھی یہ خسارے کا سودا نہیں ہے، کیونکہ اخروی منزل تو بہرحال حاصل ہو کر رہے گی۔ اس تناظر میں عام آدمی کو دین پر عمل کرنے کی بہترین صورت یہی نظر آتی ہے کہ وہ تمام معاملات زندگی کو ترک کر کے میدان جہاد کا رخ کرے اور جام شہادت نوش کر کے جنت میں اپنا مقام محفوظ کر لے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض اسالیب دین میں اپنی اصل ہی کے لحاظ سے بے بنیاد ہیں، مگر اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف اس پہلو کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ دین کو اس کے اجزا کے لحاظ سے پیش کرنا اس کی دعوت کے لیے نہایت ضرر رساں ہے۔ اس طرز عمل سے یہ نتائج لازمی طور پر نکلتے ہیں:

اولاً، دین اپنی کامل صورت میں لوگوں کے سامنے نہیں آتا۔

ثانیاً، مسلم اور غیر مسلم، دونوں طبقات کسی خاص جز ہی کے پہلو سے دین سے متعارف ہوتے ہیں۔

ثالثاً، عامۃ الناس کی اکثریت مخصوص اجزاے دین ہی کو دینی اہداف سمجھ کر اختیار کرتی ہے۔

چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ دین کی دعوت پیش کرتے ہوئے دو امور کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ دین کو اپنی کامل صورت میں بحیثیت مجموعی پیش کیا جائے اور دوسرے یہ کہ دین کے ہر جز کو وہی وزن دیا جائے جو خود دین نے اسے دیا ہے۔ زمانی یا مقامی مصالح کا خیال کر کے بعض اجزا کو اس طرح پیش نہ کیا جائے کہ دین کا اپنا قائم کیا ہوا توازن بگڑ جائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل علم ان امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کی دعوت پیش کریں۔ وہ لوگوں پر یہ واضح کریں کہ دین کی حقیقت اللہ کی بندگی ہے اور دینی زندگی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے انفرادی اور اجتماعی وجود میں فکر و عمل کی تمام جہتیں اصلاً بندگی رب کے لیے متعین کرے۔ انھیں بتائیں کہ دین کا مقصود تزکیۂ نفس ہے اور جنت کے انعام کے مستحق وہی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لوگ ہیں جو دنیا میں اپنے نفوس کو شیطانی آلایشوں سے پاک رکھنے کے لیے سرگرم عمل رہیں۔ انھیں یہ تعلیم دیں کہ دین محض اذکار اور رسوم کا نام نہیں ہے، بلکہ اس نے شریعت کی صورت میں عبادات، معاشرت، سیاست، معیشت، دعوت، جہاد، حدود و تعزیرات، غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کے لیے بنیادی اصول وقوانین وضع کیے ہیں۔ ان کی پاس داری ضروری ہے اور ان کا انکار دین کے انکار کے مترادف ہے۔ اسی جامع اسلوب میں دین کی دعوت دین و دانش کا تقاضا ہے۔ اہل علم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دین کو پوری بصیرت کے ساتھ سمجھیں اور اسے بہ تمام و کمال لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

ـــــ منظور الحسن

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۵۷)

(گزشتہ سے پیوستہ)

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ، فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ، وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ، وَاللّٰہُ وَاسِعٌ

(ہدایت وضلالت کے معاملے میں اللہ کا طریقہ یہی ہے۔ اِس لیے یہ نہیں مانتے تو اِنھیں چھوڑو اور تم اچھی طرح سمجھ لو کہ) اللہ کی راہ میں[۶۹۸] اپنے مال خرچ کرنے والوں کے اِس عمل کی مثال اُس دانے کی ہے جس سے سات بالیں نکلیں، اِس طرح کہ ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اللہ (اپنی حکمت کے مطابق) جس کے لیے چاہتا ہے، (اِسی طرح) بڑھا دیتا ہے[۶۹۹] اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ بڑی وسعت والا ہے، وہ ہر چیز

[۶۹۸] اصل میں 'فی سبیل اللّٰہ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے تحت وہ سب کام آتے ہیں جو دین کی خدمت اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیے جائیں۔

[۶۹۹] اِس مضمون کی وضاحت مسلم کی ایک حدیث (رقم ۱۱۵۲) میں بھی ہوئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ فرق ظاہر ہے کہ عمل کی نوعیت، عمل کے زمانے اور عمل کرنے والے کے ظاہری و باطنی حالات پر مبنی ہوگا۔ اگر ایک نیکی مشکل حالات اور تنگ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اُس کا اجر زیادہ ہوگا اور اگر ایک نیکی آسان حالات اور کشادہ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اُس کا اجر کم ہوگا۔ پھر نیکی کرنے والے کے احساسات کا بھی اُس پر اثر پڑے گا۔ ایک نیکی پوری خوش دلی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری سرد مہری اور نیم دلی کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے اجر و ثواب میں بھی فرق ہوگا۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۱۳)

عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ، لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ، وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ، وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ، كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ ، وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ، فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ

سے واقف ہے۔[700] جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پھر جو کچھ خرچ کیا ہے، اُس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں، نہ دل آزاری کرتے ہیں،[701] اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے ہاں اُن کا اجر ہے اور اُنھیں (وہاں) کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کوئی غم کھائیں گے۔[702] ایک اچھا بول اور (ناگواری کا موقع ہو) تو ذرا سی چشم پوشی اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے ساتھ اذیت لگی ہوئی ہو۔ اور (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اِس طرح کی خیرات سے) اللہ بے نیاز ہے۔ (اِس رویے پر وہ تمھیں محروم کر دیتا، لیکن اُس کا معاملہ یہ ہے کہ اِس کے ساتھ) وہ بڑا بردبار بھی ہے۔ ایمان والو، احسان جتا کر اور (دوسروں کی) دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اُن لوگوں کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور وہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن کو مانتے ہیں۔ سو اُن کی مثال ایسی ہے

[۷۰۰] لٰہذا اللہ کے وعدوں کو اپنی تنگ دامانی پر قیاس نہ کرو اور اپنے اجر پر مطمئن رہو۔ اللہ کے خزانے لامحدود ہیں۔ وہ جس کو جتنا چاہے کسی نیکی کا اجر دے سکتا ہے۔ تمھارا کوئی عمل بھی اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ چھوٹی، بڑی اور پوشیدہ یا علانیہ جو نیکی تم کرو گے، وہ اُس کے علم میں رہے گی۔

[۷۰۱] یعنی کم ظرفوں کی طرح کسی کو کچھ دے کر طعن و تشنیع اور توہین و تحقیر کا نشانہ نہیں بناتے۔

[۷۰۲] یہ جنت کی تعبیر ہے اور استاذ امام کے الفاظ میں یہاں اِس تعبیر میں ایک لطیف اشارہ اِس بات کی طرف بھی ہے کہ انفاق کرنے والے اِس جنت کے سزاوار اِس لیے ٹھیریں گے کہ نہ تو خدا کی راہ میں خرچ کر کے اُنھوں نے کبھی اِس بات کا غم کیا کہ کیوں خرچ کر دیا اور نہ کبھی شیطان کے ڈراووں سے متاثر ہو کر مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ہوئے کہ کل کیا کھائیں گے۔ اُن کے اِس حوصلے کے صلے میں خدا اُن کو سات سو گنے تک اجر بھی دے گا اور وہ بہشت بھی جو ماضی اور مستقبل، دونوں طرف سے اُنھیں مطمئن کر دے گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صَفُوَانٍ عَلَيۡهِ تُرَابٌ، فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ، فَتَرَکَهٗ صَلۡدًا، لَا یَقۡدِرُوۡنَ عَلٰی شَیۡءٍ مِّمَّا کَسَبُوۡا، وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۶۴﴾

کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اُس پر زور کا مینہ پڑے اور اُس کو بالکل چٹان کی چٹان چھوڑ جائے۔[۷۰۳] (قیامت کے دن) اُن کی کمائی میں سے کچھ بھی اُن کے ہاتھ نہ آئے گا۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ) اِس طرح کے ناشکروں کو اللہ کبھی راہ یاب نہیں کرتا۔[۷۰۴] ۲۶۱-۲۶۴

[۷۰۳] یہ اُس کسان کی مثال ہے جس نے کسی چٹان پر مٹی دیکھی اور اُس کو زرخیز پا کر کھیتی شروع کر دی، لیکن بارش پڑی اور اُس کے ایک ہی دونگڑے سے ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہ گئی اور نیچے سے بالکل سپاٹ پتھر نکل آیا۔ فرمایا ہے کہ خیرات کے بعد احسان جتانے اور دل آزاری کرنے والوں کی خیرات بھی اِس طرح برباد ہو جائے گی اور آخرت میں اُن کو اُس کا کوئی اجر نہ ملے گا۔ ایمان پر ہونے کے باوجود اُن کا یہ عمل اُسی طرح ضائع ہو جائے گا، جس طرح دکھانے کے لیے خرچ کرنے والے منکروں کے اعمال ضائع ہوں گے۔

[۷۰۴] یعنی اُن کے اعمال کے ثمرات و نتائج تک نہیں پہنچنے دیتا اور دنیا میں بہت کچھ کرنے کے باوجود انجام کے لحاظ سے وہ بالکل نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اوقات نماز

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رویٰ ان جبریل صلی اللّٰہ علیه وسلم نزل. فصلی. فصلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم. ثم صلی. فصلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم. ثم صلی. فصلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم. ثم صلی. فصلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم. ثم صلی. فصلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم. ثم قال: بهذا امرت[2].

روایت ہوا ہے کہ (ایک مرتبہ) سیدنا جبریل علیہ السلام (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) آئے۔ انھوں نے (پہلی) نماز پڑھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی اقتدا میں نماز پڑھی[1]۔پھر انھوں نے (دوسری) نماز ادا کی۔ نبی کریم نے بھی (ان کے ساتھ یہ) نماز ادا کی۔اس کے بعد (وہ اگلی نماز کے وقت آئے اور) انھوں نے (تیسری) نماز پڑھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی (یہ) نماز

پڑھی۔ پھر (اگلی نماز کے وقت آئے اور) انھوں نے (چوتھی) نماز پڑھی۔ آپ نے بھی نماز پڑھی۔ پھر سیدنا جبریل (اگلی نماز کے وقت تشریف لائے اور) (پانچویں) نماز ادا کی اور (ان کے ساتھ) حضور نے بھی نماز ادا کی[2]۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام نے فرمایا: (نماز کے اوقات کے معاملے میں) مجھے یہی حکم دیا گیا ہے[3]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ اہل عرب میں نماز دین ابراہیمی کی روایت کی حیثیت سے قبل از اسلام بھی رائج تھی۔ اس کے اذکار، اعمال اور اوقات کے حوالے سے بعض بدعات، البتہ اس میں در آئی تھیں۔ سنن کو بدعات سے پاک کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ چنانچہ آپ نے حج، قربانی، زکوٰۃ اور دیگر سنتوں کے ساتھ سنت نماز کی بھی تجدید و اصلاح فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی ضمن میں اوقات نماز کو واضح اور متعین کرنے کے لیے جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔

۲۔ پوری روایت سے واضح ہے کہ یہ واقعہ ایک ہی دن میں پانچ مرتبہ پیش آیا اور حضرت جبریل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ نمازوں کے اوقات کی تعلیم دی۔

۳۔ نماز کے اوقات کا حوالہ اگرچہ قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، مگر ان کا اصل ماخذ سنت ہی ہے۔ یہ روایت اسی سنت کا بیان ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۴۹۹ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۳۰۴۹، ۳۷۸۵۔ مسلم، رقم ۶۱۰۔ نسائی، رقم ۴۹۴۔ ابوداؤد، رقم ۳۹۴۔ ابن ماجہ، رقم ۶۶۸۔ موطا، رقم ۱۔ دارمی، رقم ۱۱۸۵۔ احمد بن حنبل، رقم ۲۲۴۰۷۔ ابن حبان، رقم ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۹۴۔ ابن خزیمہ، رقم ۳۵۲۔ نسائی، رقم ۱۴۸۳۔ بیہقی، رقم ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۹۱۸، ۱۹۱۹۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۲۷۔ مسند حمیدی، رقم ۴۵۱۔

۲۔ بخاری کی روایت ۳۰۴۹ میں یہی واقعہ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

روی انه كان رسول الله صلى الله عليه ''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے

وسلم يقول: نزل جبريل. فأمنى فصليت معه. ثم صليت معه. ثم صليت معه. ثم صليت معه. ثم صليت معه. يحسب باصابعه خمس صلوات.

تھے: جبریل علیہ السلام آئے۔ انھوں نے میری امامت کی اور میں نے ان کی اقتدا میں (پہلی) نماز پڑھی۔ پھر میں نے ان کے ساتھ (دوسری) نماز ادا کی۔ اس کے بعد ان کی معیت میں (تیسری) نماز ادا کی۔ پھر (چوتھی) نماز ادا کی اور پھر (پانچویں) نماز ادا کی۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ نمازوں کو انگلیوں پر گنتے ہوئے ارشاد فرمائی۔''

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

تقدیر کی تفصیل

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۱۱۳)

عن ابی الدرداء قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم إن اللّٰه عزوجل فرغ إلی کل عبد من خلقه من خمس من أجله وعمله ومضجعه وأثره ورزقه۔

''حضرت ابودرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کے متعلق پانچ چیزیں لکھ رکھی ہیں: اس کی مہلت عمر، اس کی کارکردگی، اس کا ٹھکانا، اس کا دائرۂ عمل اور اس کی روزی۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

مضجع: اس کا لغوی مطلب لیٹنے کی جگہ ہے، لیکن یہاں اس سے مراد رہنے بسنے کا مقام ہے۔

أثر: یہ لفظ نشان کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں اس سے نقل وحرکت مراد ہے۔

متون

مسند احمد سے لی گئی اس روایت کے متون میں ایک فرق تو نکات کی ترتیب کا ہے۔ یہ فرق اس طرح کے اجزا پر مشتمل کم وبیش تمام روایات میں پایا جاتا ہے۔ دوسرا فرق اجزا کے اختلاف کا ہے۔ زیر بحث روایت میں 'اجل'، 'عمل'، 'مضجع'،

’اثر‘ اور’رزق‘ پانچ چیزیں بیان ہوئی ہیں۔ایک متن میں رزق کے ساتھ’لا یعد من عبد‘ کی تصریح بھی نقل ہوئی ہے۔

اسی طرح ایک متن میں’عمل‘ اور’اثر‘ کے بجائے’شقی‘ اور’سعید‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ جملے کی تالیف سے خیال ہوتا ہے کہ زیر مطالعہ متن ہی اصل متن ہے۔

معنی

لوح محفوظ کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ اس میں تمام انسانی احوال تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ روایت اسی بات کو بیان کر رہی ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کی زندگی کے تمام معاملات تمام انسانوں کی تخلیق کے موقع ہی پر لکھ دیے گئے تھے۔ یہ روایت اللہ تعالیٰ کے مستقبل کے کامل علم کا بیان ہے اور اس اعتبار سے یہ روایت قرآن مجید کے عین مطابق ہے۔اس روایت میں بیان کیے گئے موضوعات میں سے بعض تقدیر سے متعلق بھی ہیں۔لیکن اصلاً یہ روایت علم الٰہی کے احاطے کے بیان سے متعلق ہے۔

کتابیات

احمد، رقم ۲۰۷۲۹، ۲۰۷۳۰۔ السنۃ لابن عاصم، رقم ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۷، المعجم الاوسط، رقم ۳۱۲۰۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۴)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نماز کے اعمال

نماز کے لیے جو اعمال شریعت میں مقرر کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

نماز کی ابتدا رفع یدین سے، یعنی دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر کی جائے،

قیام کیا جائے،

پھر رکوع کیا جائے،

پھر آدمی قومہ کے لیے کھڑا ہو،

پھر یکے بعد دیگرے دو سجدے کیے جائیں،

ہر نماز کی دوسری اور آخری رکعت میں نماز پڑھنے والا دو زانو ہو کر قعدے کے لیے بیٹھے،

نماز ختم کرنا پیش نظر ہو تو اِسی قعدے کی حالت میں منہ پھیر کر نماز ختم کر دی جائے۔

نماز کے یہ اعمال اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: 'صلوا کما رایتمونی اصلی[۵۹]' (نماز اُس طرح پڑھو، جس طرح تم مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو)۔ چنانچہ آپ یہ اعمال جس اہتمام کے ساتھ اور

۵۹؎ بخاری، رقم ۶۰۵۔

جس طریقے سے انجام دیتے تھے، اُس کی تفصیلات ہم اِسی مقصد سے یہاں بیان کیے دیتے ہیں۔

رفع یدین

رفع یدین آپ کبھی تکبیر کے ساتھ، کبھی تکبیر سے پہلے اور کبھی تکبیر کے بعد کرتے تھے۔[60] ہاتھ کھلے ہوتے اور ہاتھوں کی انگلیاں نہ بالکل ملاتے اور نہ پوری طرح کھول کر الگ الگ رکھتے تھے۔[61] ہاتھ اِس طرح اٹھاتے کہ کبھی کندھوں کے سامنے اور کبھی کانوں کے اوپر کے حصے تک آجاتے تھے۔[62]

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رفع یدین بعض موقعوں پر آپ رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد بھی کرتے تھے۔[63] اِسی طرح کبھی تیسری رکعت سے اٹھتے وقت[64] اور کبھی سجدے میں جاتے اور اُس سے اٹھتے ہوئے بھی کر لیتے تھے۔[65]

قیام

قیام میں آپ سیدھے[66] اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے۔[67] ہاتھ اِس طرح باندھتے کہ دائیں ہاتھ کا کچھ حصہ بائیں ہاتھ کی پشت پر، کچھ حصہ پہنچے پر اور کچھ کلائی پر ہوتا تھا۔[68] بایاں ہاتھ دائیں پر رکھ کر قیام کرنے سے آپ نے لوگوں کو منع فرمایا ہے۔[69]

بعض روایتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہوا ہے۔[70] قیام کی حالت میں ناف سے اوپر ہاتھ جہاں بھی باندھے جائیں گے، اُس کے لیے یہ تعبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ اپنے ہاتھ، جس طرح کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بالکل چھاتی پر باندھ کر کھڑے ہوتے تھے۔

۶۰۔ بخاری، رقم ۷۰۵۔ مسلم، رقم ۳۹۰، ۳۹۱۔

۶۱۔ ابوداؤد، رقم ۷۵۳۔ ابن خزیمہ، رقم ۴۵۹۔

۶۲۔ بخاری، رقم ۷۰۲، ۷۰۵۔ مسلم، رقم ۳۹۱۔ ابوداؤد، رقم ۷۲۶۔ نسائی، رقم ۸۸۱۔

۶۳۔ بخاری، رقم ۷۰۲۔ مسلم، رقم ۳۹۰۔

۶۴۔ بخاری، رقم ۷۰۶۔

۶۵۔ نسائی، رقم ۱۰۸۵۔

۶۶۔ ابوداؤد، رقم ۷۳۰۔ ابن ماجہ، رقم ۸۶۲۔

۶۷۔ مسلم، رقم ۴۰۱۔ ابوداؤد، رقم ۷۵۹۔

۶۸۔ نسائی، رقم ۸۸۹۔

۶۹۔ ابوداؤد، رقم ۷۵۵۔

۷۰۔ احمد، رقم ۲۲۰۱۷۔ ابوداؤد، رقم ۷۵۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رکوع

رکوع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیلیاں اِس طرح گھٹنوں پر رکھتے کہ لگتا تھا اُنھیں پکڑے ہوئے ہیں[۷۱]۔ انگلیاں گھٹنوں کے نیچے اور کھلی ہوتی تھیں[۷۲]، کہنیوں کو پہلوؤں سے الگ رکھتے[۷۳]، دونوں ہاتھ کمان کے چلے کی طرح تان لیتے[۷۴]، سر کو نہ جھکاتے، نہ اوپر کو اٹھاتے، بلکہ پیٹھ کے برابر کر لیتے[۷۵] اور فرماتے تھے کہ لوگو، جس نے رکوع و سجود میں اپنی کمر سیدھی نہیں رکھی، اُس کی نماز نہیں ہے[۷۶]۔

قومہ

رکوع سے قومے کے لیے اٹھتے تو بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے، یہاں تک کہ ریڑھ کی ہر ہڈی ٹھکانے پر آ جاتی تھی[۷۷]۔ عام طور پر یہ قیام رکوع کے برابر ہی ہوتا، لیکن کبھی کبھی اتنی دیر کھڑے رہتے کہ خیال ہوتا، غالباً بھول گئے ہیں[۷۸]۔ فرماتے تھے: اُس شخص کی نماز اللہ تعالیٰ کی نگاہ التفات سے محروم ہے جو رکوع سے اٹھ کر اپنی کمر سیدھی نہیں کرتا اور سجدے میں چلا جاتا ہے[۷۹]۔

سجود

سجدے میں جاتے تو انگلیوں کو ملا کر ہتھیلیاں پھیلا دیتے[۸۰]، انگلیاں قبلہ رُو[۸۱] اور ہاتھ کبھی کندھوں کے برابر، کبھی کانوں کے سامنے[۸۲] اور اتنے کھلے ہوئے ہوتے کہ بکری کا بچہ اُن کے نیچے سے نکل جائے[۸۳]۔ بازو پہلوؤں سے اِس طرح الگ رہتے تھے کہ

۷۱؎ بخاری، رقم ۷۹۳۔ ابوداؤد، رقم ۷۳۴۔

۷۲؎ احمد، رقم ۱۷۱۷، ۱۷۱۲۲۔

۷۳؎ ابوداؤد، رقم ۷۳۴۔

۷۴؎ ابوداؤد، رقم ۷۳۴۔

۷۵؎ مسلم، رقم ۴۹۸۔ ابوداؤد، رقم ۷۳۰۔

۷۶؎ ابوداؤد، رقم ۸۵۵۔ نسائی، رقم ۱۰۲۷۔ ابن ماجہ، رقم ۸۷۰۔ ۸۷۱۔

۷۷؎ بخاری، رقم ۷۹۳۔

۷۸؎ بخاری، رقم ۷۸۷۔ مسلم، رقم ۴۷۲۔

۷۹؎ احمد، رقم ۱۰۸۱۲۔

۸۰؎ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۱۶۔

۸۱؎ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۱۶۔

۸۲؎ ابوداؤد، رقم ۷۳۴۔ نسائی، رقم ۸۸۹۔

۸۳؎ مسلم، رقم ۴۹۶۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں کو آپ کی بغلوں کا گورا رنگ نظر آ جاتا تھا۔[84] پاؤں کھڑے رکھتے،[85] ایڑیاں ملاتے[86] اور پاؤں کی انگلیوں کو موڑ کر قبلہ رو کر لیتے۔[87] فرماتے تھے کہ مجھے پیشانی اور ناک، دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنوں اور دونوں پاؤں کے پنجوں پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[88]

جلسہ

دو سجدوں کے درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الٹا پیر بچھا کر اُس پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔[89] جلسے، سجود اور قومے میں آپ کے ٹھیرنے کا وقت کم و بیش یکساں ہوتا تھا۔[90] تاہم قومے کی طرح جلسے میں بھی کبھی اتنی دیر بیٹھے رہتے کہ خیال ہوتا، غالباً بھول گئے ہیں۔[91] پھر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ دوسرے سجدے کے بعد بعض اوقات آپ سیدھے کھڑے ہو جانے کے بجائے بیٹھ جاتے اور اِس کے بعد اگلی رکعت کے لیے اٹھتے تھے۔[92]

قعدہ

قعدے میں بالکل اُسی طرح بیٹھتے، جس طرح جلسے میں الٹا پیر بچھا کر اُس پر بیٹھتے تھے۔[93] سیدھا پاؤں کھڑا ہوتا،[94] دایاں ہاتھ پھیلا کر دائیں گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھ لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔[95] اِس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ بیٹھنے کے بعد باقی انگلیاں سمیٹ لیتے، انگوٹھا درمیان کی انگلی پر رکھتے اور کبھی کبھی اِن دونوں سے حلقہ بنا لیتے

[84] مسلم، رقم ۴۹۵، ۴۹۷۔

[85] مسلم، رقم ۴۸۶۔

[86] ابن خزیمہ، رقم ۶۵۴۔

[87] بخاری، رقم ۷۹۳۔

[88] بخاری، رقم ۷۷۹۔ مسلم، رقم ۴۹۰۔

[89] ابوداؤد، رقم ۷۳۰۔ ۷۳۴۔

[90] بخاری، رقم ۷۵۹۔ مسلم، رقم ۴۷۱۔

[91] بخاری، رقم ۷۸۷۔ مسلم، رقم ۴۷۲۔

[92] بخاری، رقم ۷۸۹۔ ابوداؤد، رقم ۷۳۰۔

[93] بخاری، رقم ۷۹۳۔ ابوداؤد، رقم ۷۳۱، ۷۳۴۔

[94] بخاری، رقم ۷۹۳۔ ابوداؤد، رقم ۷۳۰، ۷۳۴۔

[95] مسلم، رقم ۵۷۹، ۵۸۰۔ ابوداؤد، رقم ۷۳۴۔

یہ اشارہ توحید کی علامت ہے، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ قعدے کی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے موقع پر کیا جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تھے۔[96]

نماز کی آخری رکعت میں بعض موقعوں پر اِس طرح بھی بیٹھتے کہ بایاں کولھا زمین پر رکھتے اور الٹے پیر کو دائیں پیر کی طرف باہر کو نکال لیتے تھے۔[97]

نماز کے یہ تمام اعمال نبی صلی اللہ علیہ وسلم غایت درجہ اعتدال اور نہایت اطمینان کے ساتھ انجام دیتے[98] اور لوگوں کو اِسی کی تلقین فرماتے تھے۔[99]

[باقی]

---

۹۶ مسلم، رقم ۸۵۰۔

۹۷ بخاری، رقم ۷۹۳۔ ابوداؤد، رقم ۷۳۰، ۷۳۱۔

۹۸ ابوداؤد، رقم ۷۳۰۔

۹۹ بخاری، رقم ۷۲۴۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون سیاست

[یہ ''میزان'' کا ایک باب ہے۔نئی طباعت کے لیے مصنف نے اس میں بعض اہم ترامیم کی ہیں۔ یہ پورا باب ان ترامیم کے ساتھ ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے، اُس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ وہ تمدن کو چاہتا ہے اور پھر اس تمدن کو اپنے ارادہ و اختیار کے سوء استعمال سے بچانے کے لیے جلد یا بدیر اپنے اندر ایک نظم اجتماعی پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں سیاست و حکومت، انسان کی اِس خواہش اور اِس مجبوری ہی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اور انسان جب تک انسان ہے، وہ اگر چاہے بھی تو اِس سے نجات حاصل کر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لہٰذا عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اِس دنیا میں حکومت کے بغیر کسی معاشرے اور تمدن کا خواب دیکھنے کے بجائے وہ اپنے لیے ایک ایسا معاہدۂ عمرانی وجود میں لانے کی کوشش کرے جو نظم اجتماعی کا تزکیہ کر کے اُس کے لیے ایک صالح حکومت کی بنیاد فراہم کر سکے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ انسان کی فطرت نے اُسے بالعموم یہی راہ دکھائی اور اِسی راستے پر جد و جہد کے لیے آمادہ کیا ہے، لیکن اِس کے جو نتائج اب تک نکلے ہیں اور جنھیں ہر شخص بچشم سر اِس عالم میں دیکھ سکتا ہے، تنہا وہی اِس حقیقت کو بالکل آخری حد تک ثابت کر دینے کے لیے کافی ہیں کہ زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح عقل انسانی اس معاملے میں بھی آسمانی ہدایت کے بغیر اپنے لیے کوئی سواء السبیل تلاش نہیں کر سکتی۔ انسان کی یہی ضرورت ہے جس کے پیش نظر ایک مفصل قانون سیاست اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہمیں دیا ہے۔

یہ قانون جن مباحث کو شامل ہے، وہ یہ ہیں:

بنیادی اصول

اصل ذمہ داری

دینی فرائض

شہریت اور اس کے حقوق

نظم حکومت

ذیل میں ہم اِس قانون سے متعلق قرآن مجید کے نصوص کی وضاحت کریں گے۔

بنیادی اصول

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ، اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ، اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ. ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا. (النساء۴:۵۹)

''ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر تمھارے درمیان اگر کسی معاملے میں اختلاف رائے ہو تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اچھا ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی یہی بہتر ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ حکم اُس وقت دیا گیا جب قرآن نازل ہو رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس مسلمانوں کے درمیان موجود تھے اور وہ اپنے نزاعات کے لیے جب چاہتے، آپ کی طرف رجوع کر سکتے تھے۔ لیکن صاف واضح ہے کہ اللہ و رسول کی یہ حیثیت ابدی ہے، لہٰذا جن معاملات میں بھی کوئی حکم اُنھوں نے ہمیشہ کے لیے دے دیا ہے، اُن میں مسلمانوں کے اولی الامر کو، خواہ وہ ریاست کے سربراہ ہوں یا پارلیمان کے ارکان، اب قیامت تک اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اولی الامر کے احکام اِس اطاعت کے بعد اور اِس کے تحت ہی مانے جا سکتے ہیں۔ اِس اطاعت سے پہلے یا اِس سے آزاد ہو کر اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان اپنی ریاست میں کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ہو یا جس میں اُن کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ اہل ایمان اپنے اولی الامر سے اختلاف کا حق بے شک، رکھتے ہیں، لیکن اللہ اور رسول سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا، بلکہ اِس طرح کا کوئی معاملہ اگر اولی الامر سے بھی پیش آ جائے اور اُس میں قرآن و سنت کی کوئی ہدایت موجود ہو تو اُس کا فیصلہ لازماً اُس ہدایت کی روشنی ہی میں کیا جائے گا۔

تاہم اللہ اور رسول کی اِس اطاعت کے تحت اولی الامر کی اطاعت کے چند لوازم ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں واضح فرما دیا ہے:

اول یہ کہ اُن کے تحت جو نظم ریاست قائم کیا جائے، مسلمانوں کو اُس سے پوری طرح وابستہ رہنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس نظم کو 'الجماعۃ' اور 'السلطان' سے تعبیر کیا ہے اور اِس کے بارے میں ہر مسلمان کو پابند کیا ہے کہ اِس سے کسی

حال میں الگ نہ ہو۔ یہاں تک کہ اِس سے نکلنے کو آپ نے اسلام سے نکلنے کے مترادف قرار دیا اور فرمایا کہ کوئی مسلمان اگر اِس سے الگ ہو کر مرا تو جاہلیت کی موت مرے گا۔ آپ کا ارشاد ہے:

من رأى من اميره شيئًا يكرهه فليصبر عليه، فانه من فارق من الجماعة شبرًا فمات الا مات ميتة جاهلية.

(بخاری، رقم ۷۰۵۴)

''جس نے اپنے حکمران کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھی، اُسے چاہیے کہ صبر کرے، کیونکہ جو ایک بالشت کے برابر بھی مسلمانوں کے نظم اجتماعی سے الگ ہوا اور اِسی حالت میں مر گیا، اُس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔''

یہی روایت ایک دوسرے طریق میں اِس طرح آئی ہے:

من كره من اميره شيئًا فليصبر، فانه من خرج من السلطان شبرًا مات ميتة جاهلية. (بخاری، رقم ۷۰۵۳)

''جسے حکمران کی کوئی بات ناگوار گزرے، اُسے صبر کرنا چاہیے، کیونکہ جو ایک بالشت کے برابر بھی اقتدار کی اطاعت سے نکلا اور اِسی حالت میں مر گیا، اُس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔''

سیاسی خلفشار اور فتنہ وفساد کے زمانے میں بھی آپ کی ہدایت ہے کہ کسی مسلمان کو نظم اجتماعی کے خلاف کسی اقدام میں نہ صرف یہ کہ شریک نہیں ہونا چاہیے، بلکہ پوری وفاداری کے ساتھ اُس سے وابستہ رہنا چاہیے۔ امام مسلم کی ایک روایت میں سیدنا حذیفہ کے لیے آپ کا یہ ارشاد کہ: 'تلزم جماعة المسلمين و امامهم'[1] (اِس طرح کی صورت حال میں تم مسلمانوں کے نظم اجتماعی اور اُن کے حکمران سے وابستہ رہو گے)، ریاست سے متعلق دین کے اِسی منشا پر دلالت کرتا ہے۔

دوم یہ کہ وہ قانون کے پابند رہیں۔ جو حکم دیا جائے، اُس سے گریز وفرار کے بجائے اُسے پوری توجہ سے سنیں اور مانیں۔ کوئی اختلاف، کوئی ناپسندیدگی، کوئی عصبیت اور کسی نوعیت کا کوئی ذہنی تحفظ بھی قانون سے انحراف کا باعث نہیں بننا چاہیے، اِلّا یہ کہ خدا کی معصیت میں کوئی قانون بنایا جائے۔ ارشاد فرمایا ہے:

عليك السمع و الطاعة فى عسرك ويسرك و منشطك و مكرهك واثرة عليك. (مسلم، رقم ۱۸۳۶)

''تم پر لازم ہے کہ اپنے حکمرانوں کے ساتھ سمع وطاعت کا رویہ اختیار کرو، چاہے تم تنگی میں ہو یا آسانی میں اور چاہے یہ رضا اور رغبت کے ساتھ ہو یا بے دلی کے ساتھ اور اِس کے باوجود کہ تمھارا حق تمھیں نہ پہنچے۔''

على المرء المسلم السمع و الطاعة فيما احب و كره الا ان يؤمر بمعصية، فان امر

''مسلمان پر لازم ہے کہ خواہ اُسے پسند ہو یا ناپسند، وہ ہر حال میں اپنے حکمران کی بات سنے اور مانے، سوائے اس

[1] مسلم، رقم ۱۸۴۷۔

بمعصية فلا سمع و لا طاعة.

(مسلم، رقم ۱۸۳۹)

کے کہ اُسے کسی معصیت کا حکم دیا جائے۔ پھر اگر معصیت کا حکم دیا گیا ہے تو وہ نہ سنے گا اور نہ مانے گا۔''

اسمعوا واطيعوا وان استعمل عليكم عبد حبشي كان رأسه زبيبة.

(بخاری، رقم ۱۴۲۷)

''سنو اور مانو، اگرچہ تمھارے اوپر کسی حبشی غلام کو حکمران بنا دیا جائے جس کا سر منقا جیسا ہو۔''

اولی الامر کی اطاعت کا یہ حکم، ظاہر ہے کہ صرف مسلمان حکمرانوں کے لیے ہے۔ سورۂ نساء کی آیۂ زیر بحث میں 'اولو الامر' کے ساتھ 'منکم' کے الفاظ سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے کہ کسی شخص کے مسلمان قرار پانے کے جو شرائط قرآن میں بیان ہوئے ہیں، اُن سے انحراف کے بعد اطاعت کا یہ حکم اُس سے متعلق نہیں رہتا۔ عبادہ بن صامت کی روایت ہے:

دعانا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فبايعناه، فكان فيما اخذ علينا ان بايعنا على السمع والطاعة فى منشطنا ومكرهنا و عسرنا و يسرنا واثرة علينا، وان لا ننازع الامر اهله، قال: الا ان تروا كفرًا بواحًا، عندكم من الله فيه برهان.

(مسلم، رقم ۱۷۰۹)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیعت کے لیے بلایا تو ہم نے آپ سے بیعت کی۔ اُس میں جن باتوں کا عہد لیا گیا، وہ یہ تھیں کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے، چاہے یہ رضا و رغبت کے ساتھ ہو یا بے دلی کے ساتھ اور چاہے ہم تنگی میں ہوں یا آسانی میں اور اِس کے باوجود کہ ہمارا حق ہمیں نہ پہنچے اور یہ بھی کہ ہم اپنے حکمرانوں سے اقتدار کے معاملے میں کوئی جھگڑا نہ کریں گے۔ آپ نے فرمایا: ہاں، البتہ جب تم کوئی کھلا کفر اُن کی طرف سے دیکھو اور تمھارے پاس اِس معاملے میں اللہ کی واضح حجت موجود ہو۔''

اِسی طرح بعض روایتوں میں ہے:

انه يستعمل عليكم امراء فتعرفون و تنكرون، فمن كره فقد برى، ومن انكر فقد سلم، ولكن من رضى و تابع قالوا: يا رسول الله، الا نقاتلهم قال: لا ما صلوا. (مسلم، رقم ۱۸۵۴)

''تم پر ایسے لوگ حکومت کریں گے جن کی بعض باتیں تمھیں اچھی لگیں گی اور بعض بری۔ پھر جس نے بری باتوں کو ناپسند کیا، وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے اُن کا انکار کیا، وہ بھی محفوظ رہا۔ مگر جو اُن پر راضی ہوا اور پیچھے چل پڑا تو اُس سے پوچھا جائے گا۔ صحابہ نے پوچھا: یہ صورت

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہوتو یا رسول اللہ، کیا ہم اُن سے جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے ہوں۔''

شرار ائمتکم الذین تبغضونهم و یبغضونکم، و تلعنونهم و یلعنونکم، قیل: یا رسول اللّٰه، افلا ننابذهم بالسیف فقال : لا، ما اقاموا فیکم الصلوٰة.
(مسلم، رقم ۱۸۵۵)

''تمھارے بدترین حکمران وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں۔ تم اُن پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول، یہ صورت ہو تو کیا ہم اُن کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں؟ فرمایا: نہیں، جب تک وہ تم میں نماز قائم کرتے رہیں۔''

تاہم اِس حد کو پہنچ جانے کے بعد بھی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کا حق کسی شخص کو اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا، جب تک مسلمانوں کی واضح اکثریت اُس کی تائید میں نہ ہو۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پھر حکومت کے خلاف نہیں، بلکہ مسلمانوں کے خلاف بغاوت قرار پائے گی جو اسلامی شریعت کی رو سے فساد فی الارض ہے اور جس کی سزا قرآن میں قتل مقرر کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد، یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم، فاقتلوه. (مسلم، رقم ۱۸۵۲)

''تم کسی شخص کی امارت پر جمع ہو اور کوئی تمھاری جمعیت کو پارہ پارہ کرنے یا تمھارے نظم اجتماعی میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے اُٹھے تو اُسے قتل کر دو۔[۲]''

پھر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ بغاوت اگر مسلح بغاوت ہے تو اِس پر وہ تمام شرائط بھی آپ سے آپ عائد ہو جائیں گے جو اسلامی شریعت میں جہاد و قتال کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لیے جائز نہ ہو گا کہ وہ اُنھیں پورا کیے بغیر اِس نوعیت کا کوئی اقدام اپنے حکمرانوں کے خلاف کرے۔

اصل ذمہ داری

اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ، اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِهٖ، اِنَّ اللّٰهَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا. (النساء۴: ۵۸)

''اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ

---

۲ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ پر مبنی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کرو۔ نہایت عمدہ بات ہے یہ جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک، اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔‘‘

سورۂ نساء میں جہاں اللہ و رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا وہ بنیادی اصول بیان ہوا ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے، اُس سے متصل پہلے یہ آیت اِس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اِس اصول کی بنیاد پر جو ریاست قائم ہوگی، اُس کی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ اسے عدل وانصاف کو ہر سطح پر اور اُس کی آخری صورت میں قائم کر دینے کی جد و جہد کرتی رہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِس آیت کی تفسیر میں 'و اذا حکمتم بین الناس' کے تحت لکھتے ہیں:

’’...یہ امانت کے سب سے اہم پہلو کی تفصیل بھی ہے اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے اُس کی وضاحت بھی۔ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں اقتدار بخشتا ہے، اُن پر اولین ذمہ داری جو عائد ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کو عدل وانصاف کے ساتھ چکائیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب، شریف و وضیع، کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو۔ انصاف خریدنی و فروختنی چیز نہ بننے پائے۔ اُس میں کسی جانب داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے۔ کسی دباؤ، کسی زور و اثر اور کسی خوف و طمع کو اُس پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔

جن کو بھی اللہ تعالیٰ نے زمین میں اقتدار بخشا ہے، اِسی عدل کے لیے بخشا ہے۔ اِس وجہ سے سب سے بڑی ذمہ داری اِسی چیز کے لیے ہے۔ خدا کے ہاں عادل حکمران کا اجر بھی بہت بڑا ہے اور غیر عادل کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ اِس وجہ سے تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ بہت ہی اعلیٰ نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ تمھیں کر رہا ہے، اِس میں کوتاہی نہ ہو۔ آخر میں اپنی صفات سمیع و بصیر کا حوالہ دیا ہے کہ یاد رکھو کہ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، کوئی مخفی سے مخفی ناانصافی بھی اُس سے مخفی رہنے والی نہیں۔‘‘

(تدبر قرآن ۲/ ۳۲۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صحابۂ کرام نے جب روم و ایران کی سلطنتوں پر تاخت کی تو یہی حقیقت ہے جسے اِن الفاظ میں بیان فرمایا کہ ہم اِس دعوت کے ساتھ اٹھے ہیں کہ تم میں سے جو چاہے انسانوں کی بندگی سے نکل کر خدا کی بندگی اور دنیا کی تنگی سے نکل کر اُس کی وسعت اور ادیان کے ظلم سے نکل کر اسلام کے عدل کی طرف آ جائے[۳]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی کے پیش نظر اصرار فرمایا کہ ریاست کا کوئی منصب کسی ایسے شخص کو نہ دیا جائے جو اُس کا حریص ہو، اِس لیے کہ اُس سے پھر معاملات میں عدالت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ آپ کا ارشاد ہے:

انا، والله، لا نولی علی هذا العمل احدًا سأله و لا احدًا حرص علیه.	’’ہم، بخدا کسی ایسے شخص کو اِس نظام میں کوئی منصب نہ دیں گے جو اُسے مانگے اور اُس کے لیے حریص ہو۔‘‘

(مسلم، رقم ۱۷۳۳)

صحابہ کو بھی آپ نے نصیحت کی کہ وہ اِس معاملے میں خدا سے ڈرتے رہیں اور امارت کے طالب نہ بنیں۔ آپ نے فرمایا:

۳؎ تاریخ الامم والملوک، ابن جریر الطبری ۴/ ۱۰۷۔

لا تسأل الامارة ، ان اعطيتها عن مسألة وكلت اليها و ان اعطيتها عن غير مسألة اعنت عليها. (مسلم، رقم ۱۶۵۲)

''امارت کے طالب نہ ہو۔ اگر یہ تمھاری خواہش کے نتیجے میں تمھیں دی گئی تو تم اِسی کے حوالے کر دیے جاؤ گے اور اگر بغیر خواہش کے حاصل ہوئی تو اللہ کی طرف سے اِس میں تمھاری مدد کی جائے گی۔''

چنانچہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اِسی عدل کو قائم کر دینے کے لیے خلفاے راشدین نے اپنے دروازے فریاد اور اعتراض کرنے والوں کے لیے ہمیشہ کھلے رکھے، فقیرانہ زندگی اختیار کی، یہاں تک کہ پیوند لگے کپڑے پہنے، بوریے کو تخت بنایا اور اپنے عوام کے اندر اُنھی کی طرح اور اُنھی کے معیار پر اِس طرح جیے کہ زمین و آسمان پکار اٹھے:

سلطنت اہل دل فقر ہے، شاہی نہیں

دینی فرائض

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. (الحج ۲۲:۴۱)

''یہ اہل ایمان وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم اِن کو اِس سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، بھلائی کی تلقین کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔''

سورۂ حج کی یہ آیت وہ دینی فرائض بیان کرتی ہے جو کسی خطۂ ارض میں اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے نظم اجتماعی پر عائد ہوتے ہیں۔ نماز قائم کی جائے، زکوٰۃ ادا کی جائے، بھلائی کی تلقین کی جائے اور برائی سے روکا جائے، یہ چار باتیں اِس آیت میں مسلمانوں پر اُن کی اجتماعی حیثیت میں لازم کی گئی ہیں۔

قرآن کے اِس حکم کی تعمیل میں ریاست کی سطح پر نماز قائم کرنے کے لیے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی ہے، اُس کی رو سے:

۱۔ لوگوں سے اس بات کا تقاضا کیا جائے گا کہ وہ اگر مسلمان ہیں تو اپنے ایمان و اسلام کی شہادت کے طور پر نماز ادا کریں۔

۲۔ مسجدوں کا اہتمام اور ان کے لیے ائمہ کا تقرر حکومت کرے گی۔

۳۔ نماز جمعہ کا خطاب اور اُس کی امامت، ریاست کے صدر مقام کی مرکزی جامع مسجد میں سربراہ مملکت، صوبوں میں گورنر اور مختلف انتظامی وحدتوں میں اُن کے عمال کریں گے۔

اِسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں جو سنت قائم کی ہے، اس کی رو سے ریاست کے مسلمان شہریوں میں سے ہر وہ شخص جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں مقررہ حصہ اپنے سرمائے سے الگ کر کے لازماً حکومت کے حوالے کر دے گا اور حکومت دوسرے مصارف کے ساتھ اُس سے اپنے حاجت مند شہریوں کی ضرورتیں، اُن کی فریاد سے پہلے، اُن کے دروازے پر پہنچ کر پوری کرنے کی کوشش کرے گی۔

قرآن کا حکم ہے کہ مسلمان یہ زکوٰۃ ادا کر دیں تو اُن کے حکمران پھر اُن کی رضامندی کے بغیر اُن پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کر سکتے۔ ارشاد فرمایا ہے:

بھلائی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے کے لیے قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ ریاست کی طرف سے ایک جماعت اس کام کے لیے باقاعدہ مقرر کی جائے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۰۴)

”اور تمھارے اندر سے ایک جماعت اس کام پر مقرر ہونی چاہیے کہ وہ نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کی تلقین کرے اور برائی سے منع کرے۔ اور جو لوگ یہ اہتمام کریں گے، وہی فلاح پائیں گے[۴]۔“

اس زمانے کی تعبیر اختیار کیجیے تو گویا قرآن کا منشا یہ ہے کہ دوسرے محکموں کی طرح ایک محکمہ قانونی اختیارات کے ساتھ دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بھی ریاست کے نظام میں قائم ہونا چاہیے جو اپنے لیے متعین کردہ حدود کے مطابق اِس کام کو انجام دینے کے لیے ہمہ وقت سرگرم عمل رہتا ہے۔

اسلامی ریاست کے دینی فرائض یہی ہیں۔ دنیا میں جو ریاست بھی قائم ہوتی ہے، وہ امن اور دفاع اور ملک کی مادی خوش حالی کے لیے سعی و جہد تو ہر حال میں کرتی ہے، لیکن محض ایک ریاست سے آگے بڑھ کر جب وہ اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کرتی ہے تو اس سے قرآن مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام، اور بھلائی کی تلقین کرنے اور برائی سے لوگوں کو روکنے کی ذمہ داری سے بھی کسی حال میں غافل اور بے پروا نہ ہو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شہریت اور اُس کے حقوق

۱۔ فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ، وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ، فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ. (التوبہ ۹:۱۱)

”پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔“

۲۔ فَإِنْ تَابُوْا، وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ، وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ، فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ. (التوبہ ۹:۵)

---

[۴] یہ حکم اس وقت دیا گیا جب ہجرت کے بعد مسلمانوں کی ایک باقاعدہ ریاست مدینہ میں قائم ہو گئی۔

”پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اُن کی راہ چھوڑ دو۔“

یہ دونوں آیتیں سورۂ توبہ میں ایک ہی سلسلۂ بیان میں آئی ہیں۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ حج کے موقع پر یہ اعلان کر دیا جائے کہ مشرکین عرب میں سے جو لوگ یہ تین شرطیں پوری کر دیں، وہ دین میں تمھارے بھائی ہیں اور تمھارے لیے اللہ کا حکم یہ ہے کہ اِس کے بعد اُن کی راہ چھوڑ دو:

اولاً، کفر و شرک سے توبہ کر کے وہ اسلام قبول کر لیں۔

ثانیاً، اپنے ایمان و اسلام کی شہادت کے طور پر نماز کا اہتمام کریں۔

ثالثاً، ریاست کا نظم چلانے کے لیے اُس کے بیت المال کو زکوٰۃ ادا کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اِسی حکم کی وضاحت میں فرمایا ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا الٰه الا اللّٰه، و ان محمدًا رسول اللّٰه، ویقیموا الصلوٰة، ویؤتوا الزکوٰة. فاذا فعلوه عصموا منی دماء هم واموالهم الا بحقها، وحسابهم علی اللّٰه. (مسلم، رقم ۲۲)

”مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے جنگ کروں[۵]، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ وہ یہ شرائط تسلیم کر لیں تو اُن کی جانیں اور اُن کے مال محفوظ ہو جائیں گے، الّا یہ کہ وہ اُن سے متعلق کسی حق کے تحت اِس حفاظت سے محروم کر دیے جائیں۔ رہا اُن کا حساب تو وہ اللہ کے ذمہ ہے۔“

اس حکم پر غور کیجیے تو اس سے چند باتیں صاف واضح ہوتی ہیں:

اول یہ کہ جو لوگ یہ تین شرطیں پوری کر دیں، اِس سے قطع نظر کہ اللہ کے نزدیک اُن کی حیثیت کیا ہے، قانون و سیاست کے لحاظ سے وہ مسلمان قرار پائیں گے اور وہ تمام حقوق اُنھیں حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے، اُن کی ریاست میں اُن کو حاصل ہونے چاہییں۔

دوم یہ کہ عام مسلمان ہوں یا ارباب اقتدار، اِن شرطوں کے پورا کر دینے کے بعد اُن کا باہمی تعلق لازماً اخوت ہی کا ہے، وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اِس طرح قانونی حقوق کے لحاظ سے بالکل برابر ہیں۔ اُن کے درمیان کسی فرق کے لیے اسلام میں کوئی گنجایش نہیں مانی جا سکتی۔ قرآن نے اِس مدعا کے لیے ’فاخوانکم فی الدین‘ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، یعنی وہ دین میں تمھارے بھائی بن جائیں گے۔ ’الدین‘ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہاں اسلام مراد ہے اور ’فاخوانکم‘

۵۔ اس روایت میں جنگ کے ذکر سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ یہ محض اس لیے ہوا کہ اس وقت معاملہ مشرکین عرب سے تھا، جن کے بارے میں قرآن نے وضاحت کر دی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اُن پر اتمامِ حجت کے بعد اب اُنھیں اسلام یا تلوار میں سے کسی ایک انتخاب بہرحال کرنا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو خطاب کر کے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اِن تین شرطوں کے پورا ہو جانے کے بعد ریاست کے نظام میں تمھاری اور اِن نئے ایمان لانے والوں کی حیثیت بالکل برابر ہوگی۔ تمھارے اور اِن کے قانونی حقوق میں کسی لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

سوم یہ کہ اخوت کا یہ رشتہ قائم ہو جانے کے بعد سب مسلمانوں پر، خواہ وہ عوام میں سے ہوں یا ارباب حل وعقد میں سے، وہ تمام ذمہ داریاں خود بخود عائد ہو جاتی ہیں جو عقل وفطرت کی رو سے ایک بھائی پر اُس کے بھائی کے بارے میں عائد ہونی چاہییں۔

چہارم یہ کہ آخرت میں جواب دہی کے لحاظ سے اسلام کے مطالبات اپنے ماننے والوں سے خواہ کچھ ہوں، اُس کی ریاست اپنے مسلمان شہریوں سے جو مطالبات کر سکتا ہے، وہ بس یہ تین ہی مطالبات ہیں جو اِن آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے پوری وضاحت کے ساتھ خود بیان فرما دیے ہیں۔ اِن میں نہ کمی کے لیے کوئی گنجایش ہے اور نہ بیشی کے لیے۔ عالم کے پروردگار نے اِن پر خود اپنی مہر ثبت کر دی ہے۔ اِس وجہ سے کوئی قانون، کوئی ضابطہ، کوئی حکومت، کوئی شوریٰ، کوئی پارلیمان اب قیامت تک اِن شرائط کے پورا کر دینے کے بعد مسلمانوں کی جان، مال، آبرو اور عقل ورائے کے خلاف کسی نوعیت کی کوئی تعدی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کی ریاست کے پہلے حکمران سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب مانعین زکوٰۃ کے خلاف کارروائی کا حکم دیا تو لوگوں کے معارضہ پر یہ حقیقت پوری قطعیت کے ساتھ اِس طرح واضح فرمائی:

قال اللّٰه تعالٰی : فان تابوا واقاموا الصلوٰة،	''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اِس کے بعد اگر وہ توبہ کر لیں،
واتوا الزكوة، فخلوا سبيلهم. واللّٰه، لا	نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو اُن کی راہ چھوڑ دو،
اسئل فوقهن ، ولا اقصر دونهن .	(اِس لیے) خدا کی قسم، میں اِن شرطوں پر کسی اضافے کا
(احکام القرآن، الجصاص ۲/ ۸۲)	مطالبہ کروں گا اور نہ اِن میں کوئی کمی برداشت کروں گا۔''

اِس سے واضح ہے کہ ریاست اپنے مسلمان شہریوں کو کسی جرم کے ارتکاب سے روک سکتی اور اُس پر سزا تو دے سکتی ہے، لیکن دین کے ایجابی تقاضوں میں سے نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتی۔ وہ، مثال کے طور پر، اُنھیں روزہ رکھنے کا حکم نہیں دے سکتی۔ اُن میں سے کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ وہ صاحب استطاعت ہے، اُسے حج پر جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔ جہاد وقتال کے لیے جبری بھرتی کا کوئی قانون نافذ نہیں کر سکتی۔ مختصر یہ کہ جرائم کے معاملے میں اُس کا دائرۂ اختیار آخری حد تک وسیع ہے، لیکن شریعت کے اوامر میں سے اِن دو ـــــ نماز اور زکوٰۃ ـــــ کے سوا باقی سب معاملات میں یہ صرف ترغیب وتلقین اور تبلیغ وتعلیم ہی ہے جس کے ذریعے سے وہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جدوجہد کر سکتی ہے۔ اِس طرح کے تمام معاملات میں اِس کے سوا کوئی چیز اُس کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں اِسی بنا پر فرمایا:

ان اموالکم ودماءکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا، فی بلدکم ھذا، شھرکم ھذا[6]. (احمد بن حنبل، رقم ۲۰۳۷)

''تمھارے مال، تمھاری جانیں اور تمھاری آبروئیں، تم پر اُسی طرح حرام ہیں، جس طرح تمھارے اِس دن (یوم النحر) کی حرمت تمھارے اِس شہر (ام القریٰ مکہ) میں اور تمھارے اِس مہینے (ذوالحجہ) میں۔''

یہ مسلمانوں کے حقوق ہیں۔ رہے اِس ریاست کے غیر مسلم شہری تو حالات و مصالح کی رعایت سے اور بین الاقوامی معاہدات کے مطابق اُن کے ساتھ ہم جو معاملہ چاہیں، کر سکتے ہیں۔ اِس باب میں ہمارے لیے بہترین نمونہ وہ عہد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمام حجت سے پہلے یثرب کے یہود کے ساتھ کیا تھا۔ تاریخ میں یہ ''میثاق مدینہ'' کے نام سے معروف ہے۔ اِس طرح کے معاہدے مسلمانوں نے بعد میں دوسری قوموں کے ساتھ بھی کیے۔ یہ، ظاہر ہے کہ حالات کے لحاظ سے مختلف شرائط پر کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ میثاق مدینہ کو اگر دیکھیے تو اِس میں یہ دفعہ پوری صراحت کے ساتھ ثبت ہوئی ہے کہ مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار تسلیم کر لینے کے بعد یہود مسلمانوں ہی کی طرح ایک مستقل گروہ ہیں، لہٰذا اُن کے حقوق اب وہی ہوں گے جو یثرب کی اِس ریاست میں اُس کے مسلمان شہریوں کو حاصل ہیں:

وان یھود امۃ مع المؤمنین، للیھود دینھم وللمسلمین دینھم، موالیھم وانفسھم. (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۱۰۷)

''یہود اِس دستور کے مطابق، سیاسی حیثیت سے، مسلمانوں ہی کی طرح ایک امت تسلیم کیے جاتے ہیں۔ رہا دین کا معاملہ تو یہودی اپنے دین پر رہیں گے اور مسلمان اور اُن کے موالی، سب اپنے دین پر۔''

یہاں کسی شخص کو سورۂ توبہ (۹) کی آیت 'قاتلوا الذین لا یومنون' اِس نقطۂ نظر کی تردید میں پیش نہیں کرنی چاہیے۔ اِس آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق سے واضح ہے کہ اِس کا حکم اُن اہل کتاب کے لیے تھا جن پر نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم بنی اسمٰعیل کے اہل ایمان نے اتمام حجت کیا اور اُن کے کفر کی پاداش میں سنت الٰہی کے مطابق یہ سزا اُن پر نافذ کر دی کہ وہ اگر قتل سے بچنا چاہتے ہیں تو ریاست کی شہریت کے لیے:

اولاً، جزیہ ادا کریں؛

ثانیاً، ریاست کے نظام میں مسلمانوں کے زیردست ہو کر رہیں۔

ارشاد فرمایا ہے:

۶؎ یہ روایت مسلم، کتاب الحج میں بھی موجود ہے، لیکن وہاں 'اعراضکم' کے الفاظ نہیں ہیں، اس لیے ہم نے مسند کے متن کو ترجیح دی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ، وَلَا يُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ، وَلَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ. (التوبہ ۹:۲۹)

''اِن (اہل کتاب) سے لڑو جو نہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں، نہ اللہ اور اُس کے رسول نے جو کچھ حرام ٹھیرایا ہے، اُسے حرام ٹھیراتے ہیں اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے ہیں۔ (اِن سے لڑو)، یہاں تک کہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور زیر دست بن کر رہیں۔''

سورۂ توبہ کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کی ایک فرع اور اُنھی اقوام کے ساتھ خاص تھا جن پر یہ حجت پوری کی گئی۔ اِس کے بعد اب دنیا کے کسی غیر مسلم سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

نظم حکومت

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ. (الشوریٰ ۴۲:۳۸)

''اور اُن کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے۔''

اسلام کے قانون سیاست میں نظم حکومت کی اساس یہی آیت ہے۔ سورۂ شوریٰ میں تین لفظوں کا یہ جملہ اپنے اندر جو جہان معنی سمیٹے ہوئے ہے، اُس کی تفصیل یہ ہے:

اِس میں پہلا لفظ 'امر' ہے۔ عربی زبان میں یہ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن آیۂ زیر بحث میں اِس کا موقع محل دلیل ہے کہ یہ نظام کے مفہوم میں ہے۔ یہ معنی اِس لفظ میں حکم ہی کے معنی میں وسعت سے پیدا ہوئے ہیں۔ حکم جب بہت سے لوگوں سے متعلق ہوتا ہے تو اپنے لیے حدود مقرر کرتا اور قواعد وضوابط بناتا ہے۔ اُس وقت اِس کا اطلاق سیاسی اقتدار کے احکام اور جماعتی نظم، دونوں پر ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو لفظ نظام ہماری زبان میں اِسی مفہوم کی تعبیر کے لیے بولا جاتا ہے۔

پھر اِس مقام پر چونکہ قرآن مجید نے اِسے ضمیر غائب کی طرف اضافت کے سوا کسی دوسری صفت سے مخصوص نہیں کیا، اِس لیے نظام کا ہر پہلو اِس میں شامل سمجھا جائے گا۔ بلدیاتی مسائل، قومی وصوبائی امور، سیاسی ومعاشرتی احکام، قانون سازی کے ضوابط، اختیارات کا سلب وتفویض، امرا کا عزل ونصب، اجتماعی زندگی کے لیے دین کی تعبیر، غرض نظام ریاست کے سارے معاملات اِس آیت میں بیان کیے گئے قاعدے سے متعلق ہوں گے۔ ریاست کا کوئی شعبہ اِس کے دائرے سے باہر اور کوئی حصہ اِس کے اثرات سے خالی نہ ہوگا۔

اِس کے بعد 'شورٰی' ہے۔ یہ 'فعلٰی' کے وزن پر مصدر ہے اور اِس کے معنی مشورہ کرنے کے ہیں۔ آیت زیر بحث

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

میں اِس کے خبر واقع ہونے سے جملے کا مفہوم اب وہ نہیں رہا جو 'شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ'[ے] میں ہے۔ وہی بات کہنی مقصود ہوتی تو الفاظ غالباً یہ ہوتے: 'وفی الامر ھم یشاورون' (اور معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے)۔ اِس صورت میں ضروری تھا کہ معاشرہ امیر و مامور میں پہلے سے تقسیم ہو چکا ہوتا۔ امیر یا تو مامور من اللہ ہوتا یا قہر و تغلب سے اقتدار حاصل کر لیتا یا کوئی امام معصوم اُسے نامزد کر دیتا۔ بہرحال وہ کہیں سے بھی آتا اور کسی طرح بھی امارت کے منصب تک پہنچتا، صرف اِسی بات کا پابند ہوتا کہ قومی معاملات میں کوئی راے قائم کرنے سے پہلے لوگوں سے مشورہ کر لے۔ اجماع یا اکثریت کا فیصلہ تسلیم کر لینے کی پابندی اُس پر نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ راے کے رد و قبول کا اختیار اُسی کے پاس ہوتا۔ وہ چاہتا تو کسی کی راے قبول کر لیتا اور چاہتا تو بغیر کسی تردد کے اُسے رد کر دیتا۔

لیکن 'امرھم شوریٰ بینھم' کی صورت میں اسلوب میں جو تبدیلی ہوئی ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ خود امیر کی امارت مشورے کے ذریعے سے منعقد ہو۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں۔ جو کچھ مشورے سے بنے، وہ مشورے سے توڑا بھی جا سکے۔ جس چیز کو وجود میں لانے کے لیے مشورہ لیا جائے، ہر شخص کی راے اُس کے وجود کا جز بنے۔ اجماع و اتفاق سے فیصلہ نہ ہو سکے تو فصل نزاعات کے لیے اکثریت کی راے قبول کر لی جائے۔

ہم اپنی زبان میں مثال کے طور پر یہ کہیں کہ: ''اِس مکان کی ملکیت کا فیصلہ اِن دس بھائیوں کے مشورے سے ہوگا'' تو اِس کے صاف معنی یہی ہوں گے کہ دس بھائی ہی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں اور اُن میں سے کسی کی راے کو دوسرے کی راے پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔ وہ سب بالاتفاق ایک ہی نتیجے پر پہنچ جائیں تو خیر، ورنہ اُن کی اکثریت کی راے فیصلہ کن قرار پائے گی۔ لیکن یہی بات اگر اِس طرح کہی جائے کہ: ''مکان کی ملکیت کا فیصلہ کرتے وقت اِن دس بھائیوں سے مشورہ لیا جائے گا'' تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار اِن دس بھائیوں کو چھوڑ کر کسی اور شخص کے پاس ہے۔ اصل راے اُسے قائم کرنی ہے اور اُسی کی راے نافذ العمل ہوگی۔ راے قائم کرنے سے پہلے، البتہ اُسے چاہیے کہ اِن بھائیوں سے بھی مشورہ کرے۔ اِس صورت میں، ظاہر ہے کہ وہ اُن کے اجماع کا پابند ہوگا نہ اُن کی اکثریت کا فیصلہ قبول کرنا اُس کے لیے ضروری ہو گا۔

ہمارے نزدیک چونکہ مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی اساس 'امرھم شوریٰ بینھم' ہے، اِس لیے اُن کے امرا و حکام کا انتخاب اور حکومت و امارت کا انعقاد مشورے ہی سے ہوگا اور امارت کا منصب سنبھال لینے کے بعد بھی وہ یہ اختیار نہیں رکھتے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی راے کو رد کر دیں۔

صاحب ''تفہیم القرآن'' مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ے آلِ عمران ۳: ۱۵۹، ''نظم اجتماعی کے معاملے میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ پھر جب کوئی فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسا کرو۔''

''امرھم شوریٰ بینھم' کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں، اُنھیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور اُنھیں اِس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اُس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور اُن کے ہاتھ پاؤں کس کر اور اُن کو بے خبر رکھ کر اُن کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے، جسے کوئی شخص بھی 'امرھم شوریٰ بینھم' کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اُسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی اُن کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی یا تحریص واطماع سے خریدی ہوئی یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی، درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اُس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر یا مال سے خرید کر یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیں اور اِس طرح کے اظہار رائے کی اُنھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر یا کسی جتھا بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہو گی، نہ کہ 'امرھم شوریٰ بینھم' کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے'' بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔'' اِس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اِس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔''
(۴/۵۰۹۔۵۱۰)

قرآن مجید کا یہ اصول عقل وفطرت سے بھی ثابت ہے۔ مسلمانوں کا کوئی فرد معصوم نہیں ہوتا۔ علم وتقویٰ میں ہو سکتا ہے کہ وہ سب سے ممتاز ہو، امارت وخلافت کے لیے وہ احق ہو سکتا ہے اور اپنے کو احق سمجھ بھی سکتا ہے، لیکن جس طرح مجرد یہ

فضیلت اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی رائے کو نظر انداز کر کے خلافت کا منصب سنبھالنے کی کوشش کرے، اسی طرح مسلمانوں کے مشورے سے امارت کے منصب پر فائز ہو جانا بھی اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اب وہ ہر خطا سے محفوظ ہے اور اسے یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی تنہا رائے کے مقابلے میں اہل الرائے کے اجماع یا ان کی اکثریت کی رائے کو رد کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل تھا اور اسی وجہ سے حاصل تھا کہ آپ فی الواقع ایک معصوم ہستی تھے، لیکن تاریخ وسیر کی کتابوں سے اس امر کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی کہ آپ نے کسی معاملے میں اپنی رائے کے مقابلے میں مسلمانوں کے اہل الرائے کی اکثریت کو نظر انداز کر دیا ہو۔

امیر بہر حال ایک فرد ہی ہوتا ہے اور فرد کی رائے کے مقابلے میں ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ایک جماعت کی رائے میں صحت واصابت کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ امیر کو، اگر وہ فی الواقع ایک خدا ترس شخص ہے تو اپنی رائے کو وہی حیثیت دینی چاہیے جس کا اظہار فقہِ اسلامی کے ایک جلیل القدر امام نے اپنے اس قول میں کیا ہے کہ: ہم اپنی رائے کو صحیح کہتے ہیں، لیکن اس میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں اور دوسروں کی رائے کو غلط کہتے ہیں، لیکن اس میں صحت کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔

پھر یہ حقیقت ہے کہ مشورہ دینے والوں کو اگر اس بات کا احساس ہو کہ ان کے اجماع یا اکثریت کی رائے بھی ضروری نہیں کہ قبول کر لی جائے تو اول تو وہ مشورہ دینے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ طوعاً و کرہاً اس پر راضی بھی ہو گئے تو سخت بے دلی کے ساتھ مشورہ دیں گے۔ مسئلۂ زیرِ بحث کبھی ان کے غور و خوض کا حصہ نہ بن سکے گا۔ وہ شوریٰ میں کشاں کشاں لائے جائیں گے اور افسردہ خاطر ہو کر وہاں سے واپس ہو جائیں گے۔ سیاسی نظام اور ریاستی اداروں کے ساتھ ان کے دل و دماغ اور جذبات کا تعلق کبھی استوار نہ ہو سکے گا۔ قاضی ابو بکر جصاص نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں مشورہ دینے کے اس نفسیاتی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

وغیر جائز ان یکون الامر بالمشاورة علی جهة تطییب نفوسهم، و رفع اقدارهم، والت قتدی الامة به فی مثله، لانه لو کان معلوما عندهم فی استنباط ما شوورو افیه، وصواب الرأی فیما سئلوا عنه، ثم لم یکن فی ذلك معمولاً علیه، ولا متلقی منه بالقبول بوجه، لم یکن فی ذلك تطییب نفوسهم ولا رفع لاقدارهم، بل فیه ایحاشهم واعلامهم بان اراءهم

''اور جائز نہیں ہے کہ مشورہ کرنے کا یہ حکم محض صحابہ کی دل داری اور ان کی عزت افزائی کے لیے ہو یا محض اس لیے ہو کہ اس طرح کے معاملات میں امت آپ کے طریقے کی پیروی کرے، حالاں کہ اگر صحابہ کو یہ معلوم ہوتا کہ جب وہ مشورہ طلب امور میں اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں کھپا کر کوئی رائے دیں گے تو اس پر نہ عمل ہو گا اور نہ کسی پہلو سے اس کی قدر کی جائے گی تو اس سے ان کی دل داری اور عزت افزائی تو کیا ہوتی، الٹا وہ متوحش ہوتے اور سمجھتے کہ ان کی رائیں نہ قبول کیے جانے کے لیے ہیں نہ

غير مقبولة، ولا معمول عليها، فهٰذا تاويل ساقط لا معنى له فكيف يسوغ تاويل من تاوله لتقتدى به الامة، مع علم الامة عند هذا القائل بان هٰذه المشورة لم تفد شيئاً، ولم يعمل فيها بشیء اشاروا به. (۴۱/۲)

عمل کیے جانے کے لیے۔ لہٰذا احکام مشورہ کی یہ تاویل نا قابلِ اعتبار اور بے معنی ہے۔ پھر تاویل کا یہ پہلو کہ یہ حکم امت کو آپ کے طریقے کی تعلیم دینے کے لیے دیا گیا تھا، کس طرح درست ہوسکتا ہے، جب کہ کہنے والے کے نزدیک بھی یہ بات امت کے علم میں ہوگی کہ اس مشورے نے نہ کوئی فائدہ دیا اور نہ کسی معاملے میں اس کے مطابق عمل کیا گیا۔‘‘

یہاں ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف کارروائی اور لشکرِ اسامہ کی روانگی کے بارے میں سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کو اس کی تردید میں پیش کریں، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’(مانعینِ زکوٰۃ کے) اس واقعہ پر غور کرنے سے چند حقیقتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

ایک یہ کہ یہ معاملہ شوریٰ اور خلیفہ کے درمیان کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس کو شوریٰ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا تھا۔ شوریٰ کے سامنے وہ معاملات پیش ہوتے ہیں جو اجتہاد اور امورِ مصلحت سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ دین کا ایک منصوص مسئلہ ہے۔ اسلامی حکومت میں کسی ایسی جماعت کے بحیثیتِ مسلم حقوقِ شہریت باقی ہی نہیں رہتے جو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دے[8]۔ یہ چیز اسلامی قانون میں طے شدہ ہے۔ اس وجہ سے حضرت ابوبکر کی ذمہ داری یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو شوریٰ کے سامنے رکھتے، بلکہ بحیثیت خلیفہ ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ وہ اس بارے میں قانون کی تنفیذ کرتے۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ اسلامی حکومت کے حدود میں کوئی جماعت اگر قتل و غارت شروع کر دے تو خلیفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس جماعت کی سرکوبی کے لیے شوریٰ سے اجازت طلب کرے، بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ قرآن نے محاربین کے لیے جو قانون بتایا ہے، اس کی تنفید کے لیے اپنے اختیارات بے دھڑک استعمال کرے۔

دوسری یہ کہ جن لوگوں نے امیر کے اس اقدام سے متعلق تردد کا اظہار کیا، ان کو ایک حدیث کے سمجھنے میں غلط فہمی ہو رہی تھی۔ حضرت ابوبکر نے اس حدیث کے اجمال کو ایک دوسری حدیث سے جو خود انھوں نے حضور سے سنی تھی، واضح کر دیا جس سے لوگ مطمئن ہو گئے[9]۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کے نزدیک اس حدیث سے زیادہ وقیع حدیث اور کون سی ہوسکتی تھی

---

[8] اس کی تفصیل اوپر ’’شہریت اور اس کے حقوق‘‘ کے زیرِ عنوان ہم نے وضاحت کے ساتھ پیش کر دی ہے۔

[9] اور انھوں نے پھر کسی شوریٰ کے بلانے پر اصرار نہیں کیا۔

جس کے راوی حضرت ابوبکر صدیق ہوں۔

تیسری یہ کہ حضرت ابوبکر نے یہ جو فرمایا کہ اگر ان لوگوں سے لڑنے کے لیے میں کسی کو نہیں پاؤں گا تو میں تنہا ان سے لڑوں گا، شوریٰ کے کسی فیصلے کو ویٹو کرنے والی بات نہیں ہے، بلکہ یہ اس ذمہ داری کا صحیح صحیح اظہار و اعلان ہے جو دین کے واضح اور قطعی احکام کی تنفیذ اور ان کے اجرا سے متعلق بحیثیتِ خلیفہ اور پر عائد ہوتی تھی۔ اسلام میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی تنفیذ کے لیے خلیفہکی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ان کی تنفیذ کے لیے اپنی جان لڑا دے، اگرچہ ایک شخص بھی اس کا ساتھ نہ دے۔ جمہور کے مشوروں کا پابند وہ مصلحتی اور اجتہادی امور میں ہے نہ کہ شریعت کی قطعیات میں۔

اسی طرح لشکرِ اسامہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ساری تیاریاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضور کی حیاتِ مبارک ہی میں ہو چکی تھیں۔ اس کے لیے اشخاص بھی حضور کے منتخب کردہ تھے۔ اس کے لیے جھنڈا بھی خود حضور نے باندھا تھا، یہاں تک کہ اگر حضور کی علالت نے تشویش انگیز شکل نہ اختیار کر لی ہوتی تو یہ لشکر روانہ ہو چکا تھا۔ اسی دوران میں حضور کا وصال ہو گیا اور حضور کے بعد حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے۔ انھوں نے خلیفہ ہونے کے بعد قدرتی طور پر اپنی سب سے بڑی ذمہ داری یہ سمجھی کہ حضور جس لشکر کے بھیجنے کی ساری تیاریاں اپنے سامنے کر چکے تھے اور جس کے جلد سے جلد بھیجنے کے دل سے آرزو مند تھے۔ اس لشکر کو اس کی پیشِ نظر مہم پر روانہ کر دیں۔ بحیثیت خلفیۂ رسول کے ان کی سب سے بڑی ذمہ داری اور ان کے لیے سب سے بڑی سعادت اس وقت کوئی ہو سکتی تھی تو بلا ریب یہی ہو سکتی تھی کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کو پورا کریں۔ اس کام کے لیے وہ شوریٰ سے مشورہ کے محتاج نہ تھے، کیونکہ اس لشکر کے بھیجنے کے فیصلہ سے متعلق سارے امور خود حضور کے سامنے، بلکہ خود حضور کے حکم سے طے پا چکے تھے۔ پیغمبر کے خلیفہ کی حیثیت سے، ان کا کام پیغمبر کے فیصلہ کو نافذ کرنا تھا نہ کہ اس کو بدل دینا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے جب وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر اس لشکر کو خلافِ مصلحت قرار دیا تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہے، میں اس کو کھولنے کے لیے تیار نہیں۔

بہر حال، یہ دونوں واقعے کسی طرح بھی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتے کہ خلیفہ کو شوریٰ کے فیصلے رد کر دینے کا حق ہے۔ یہ اگر دلیل ہیں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا اور رسول کے قطعی احکام کی تنفیذ کے معاملے میں خلیفہ شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری صرف ان احکام کی تنفیذ ہے۔'' (اسلامی ریاست ۳۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے اپنے تمدن کے لحاظ سے 'امرھم شوریٰ بینھم' کے اس قرآنی اصول کے مطابق نظمِ اجتماعی میں عام مسلمانوں کی شرکت کا جو طریقہ اپنے زمانے میں اختیار فرمایا، اس کی تفصیلات یہ ہیں۔

اولاً، یہ اصول قائم کیا گیا کہ مسلمان اپنے معتمد لیڈروں کی وساطت سے شریکِ مشورہ ہوں گے۔ بخاری میں ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ان رسول الله صلی اللّٰہ علیه وسلم قال حین اذن الهم المسلمون فی عتق سبی هوازن، فقال: انی لا ادری من اذن فیکم ممن لم یاذن، فارجعوا احتی یرفع الینا عرفاء کم امر کم. (رقم۶۷۷۶)

''مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جب ہوازن کے قیدی رہا کرنے کی جازت دی تو آپ نے فرمایا: میں نہیں جان سکا کہ تم میں سے کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی۔ پس تم جاؤ اور اپنے لیڈروں کو بھیجو تا کہ وہ تمھاری رائے سے ہمیں آگاہ کریں۔''

سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں دارمی کی روایت ہے:

فان اعیاه ان یجد فیه سنة من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، جمع رؤس الناس وخیارهم، فاستشارهم۔ فاذا اجتمع رایهم علی امرقضی به.(۵۳)

''پھر اس معاملے میں اگر انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت نہ ملتی تو قوم کے اعیان و اکابر کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ کسی بات پر جم جاتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ حیثیت قبائل کے سرداروں کو حاصل تھی۔ اوس وخزرج اور قریش کے سردار لفظ کے ہر مفہوم میں ان قبائل کے معتمد تھے۔ بے شک، یہ منصب ان کو انتخابات کے ذریعے سے حاصل نہیں ہوا تھا اور اس زمانے کے تمدنی حالات میں اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ ان حضرات کے سماجی مقام اور فہم و تجربہ کی وجہ سے سیاسی و اجتماعی معاملات میں انھی کو مرجع بناتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی انھیں یہ اعتماد ان کے قبائل کی آزادانہ مرضی سے حاصل تھا اور اسلام لانے کے بعد بھی ان کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ اسلام سے قبل تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ جبر و استبداد سے اولوالامر بن بیٹھے تھے، لیکن اسلام لانے کے بعد اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ ان کے اتباع و عوام جب چاہتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان پر عدم اعتماد کا اظہار کر سکتے تھے۔ اور اگر وہ ایسا کرتے تو یہ حضرات یقیناً اس منصب پر برقرار نہ رہ سکتے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں تمام اہم فیصلے انھی سرداروں کے مشورے سے کیے اور خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی اربابِ حل و عقد کی حیثیت سے ان کا یہ مقام اسی طرح برقرار رہا۔

سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عراق و شام کی زمینوں کے بارے میں ایک شوریٰ کے انعقاد کا حال بیان کرتے ہوئے قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں:

قالوا: فاستشر، قال: فاستشار المهاجرین الاولین فاختلفوا، فاما عبد

''لوگوں نے کہا: تو پھر آپ باقاعدہ مشورہ کیجیے۔ اس پر آپ نے مہاجرینِ اولین سے مشورہ کیا تو ان کی رایوں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الرحمن بن عوف رضي الله عنه فكان رأيه ان تقسم لهم حقوقهم، ورأى عثمان و علي وطلحة و ابن عمر رضي الله عنهم رأى عمر، فارسل الى عشرة من الانصار: خمسة من الاوس وخمسة من الخزرج، من كبرائهم واشرفهم.

(کتاب الخراج ۲۷)

میں بھی اختلاف تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف کی رائے تھی کہ ان لوگوں کے حقوق انھی میں تقسیم کر دینے چاہییں اور عثمان، علی، طلحہ اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم حضرت عمر سے متفق تھے۔ پھر آپ نے انصار میں سے دس افراد کو بلایا۔ پانچ اوس کے اکابر و اشراف میں سے اور پانچ خزرج کے اکابر و اشراف میں سے۔"

اہل شوریٰ کے مقابلے میں اپنی حیثیت سیدنا عمر نے اس مجلس میں اس طرح واضح فرمائی:

انی لم ازعجکم الا لان تشترکوا فی امانتی فیما حملت من امورکم، فانی واحد کاحدکم... ولست اریدان تتبعوا هذا الذی هوای. (کتاب الخراج ۲۷)

"میں نے آپ لوگوں کو اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ کے معاملات کا جو بارِ امانت مجھ پر ڈالا گیا ہے، اس کے اٹھانے میں آپ میری مدد کریں۔ میں آپ ہی جیسا ایک شخص ہوں ... اور نہیں چاہتا کہ آپ ان معاملات میں میری خواہش کی پیروی کریں۔"

اس طرح کی مجالس کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا کہ 'الصلوة جامعة' یعنی لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دو رکعت نماز پڑھتے، پھر ایک مختصر تقریر فرماتے اور جس معاملے پر رائے لینا مقصود ہوتی، اسے بحث کے لیے پیش کر دیتے۔ عراق و شام کی زمینوں کا معاملہ اور معرکۂ نہاوند کے موقع پر خود امیر المومنین کے میدانِ جنگ میں جانے کا مسئلہ انھی مجالس میں طے ہوا۔ اسی طرح فوج کی تنخواہ، عمال کے تقرر، دفتر کی ترتیب، غیر قوموں کے لیے تجارت کی آزادی اور ان سے متعلق محاصل وغیرہ کے معاملات بھی انھی مجالس میں پیش ہو کر طے پائے۔ طبقات ابنِ سعد، کنز العمال، تاریخ طبری، کتاب الخراج اور اس طرح کی بعض دوسری کتابوں میں ان کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ روزانہ انتظامات کے لیے خاص برسرِ اقتدار جماعت کے اعیان و اکابر پر مشتمل ایک اور مجلس بھی تھی جس کے اجلاس مسجدِ نبوی میں منعقد ہوتے رہتے تھے:

کان للمهاجرين مجلس فی المسجد. فكان عمر يجلس معهم فيه، ويحدثهم عما ينتهی اليه من امور الآفاق.

(فتوح البلدان ۲۶۶)

"مسجد نبوی میں مہاجرین کی ایک مجلس منعقد ہوتی تھی اور حضرت عمر اس میں بیٹھتے اور اس کے سامنے وہ تمام حالات پیش کیا کرتے تھے جو مملکت کے مختلف گوشوں سے ان کو پہنچتے تھے۔"

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ثانیاً، یہ روایت قائم کی گئی کہ امامت و سیاست کا منصب ریاست میں موجود مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں سے اس گروہ کا استحقاق قرار پائے گا جسے عام مسلمانوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو گا۔

رسول اللہ نے صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے یہ فرمایا کہ حکومت کے لیے آپ کے جانشین آپ کے بعد انصار کے بجائے قریش ہوں گے۔ آپ نے فرمایا:

ان ھذا الامر فی قریش ، لا یعادیھم احد الا کبہ اللّٰہ فی النار علی وجھہ ما اقاموا الدین. (بخاری، رقم ۳۱۳۹)

''ہمارا یہ اقتدار قریش کو منتقل ہو جائے گا، جب تک وہ دین پر قائم رہیں۔ اِس معاملے میں جو شخص بھی اُن کی مخالفت کرے گا، اللہ اُسے اوندھے منہ آگ میں ڈال دے گا۔''

چنانچہ انصار کو آپ نے ہدایت کی کہ 'قدموا قریشاً و لا تقدموھا'[۱۰] (اس معاملے میں قریش کو آگے کرو اور ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو) اپنے اِس فیصلے کی وجہ یہ بیان فرمائی:

الناس تبع لقریش فی ھذا الشان، مسلمھم لمسلمھم، و کافرھم لکافرھم. (مسلم، رقم ۱۸۱۸)

''لوگ اِس معاملے میں قریش کے تابع ہیں۔ عرب کے مومن اُن کے مومنوں کے پیرو ہیں اور اُن کے کافر اُن کے کافروں کے۔''

اِس طرح یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل واضح کر دی کہ عرب کے مسلمانوں کا اعتماد چونکہ قریش کو حاصل ہے، اِس لیے قرآن مجید کی ہدایت ——— امرھم شوریٰ بینھم ——— کی روشنی میں امامت عامہ کا مستحق پورے عرب میں اُن کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور انتقال اقتدار کا یہ فیصلہ کسی نسبی تفوق یا نسلی ترجیح کی بنا پر نہیں، بلکہ اُن کی اِس حیثیت ہی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

تاریخِ عرب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں سیاسی اقتدار اسی گروہِ قریش کو حاصل تھا اور انھی کے اشراف عرب کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ بدر و احد کے معرکوں میں ان لیڈروں کی بڑی اکثریت اگرچہ تلوار کے گھاٹ اتار دی گئی تھی، لیکن بحیثیتِ جماعت عربوں کا اعتماد اب بھی قریش ہی کو حاصل تھا۔ ان میں سے جو بڑے بڑے لوگ ایمان لائے وہ سب مدینہ میں جمع تھے اور بہت سے لوگوں کو ان کی اسلامی خدمات نے دوسروں سے ممتاز کر دیا تھا۔ یہی لوگ تھے جن کے لیے مہاجرین کا اصطلاحی نام استعمال ہوتا تھا اور عام عربوں کے قبولِ اسلام کے بعد ان کے لیڈر اب مسلمانوں میں اسی اعتماد و رسوخ کے حامل تھے جو زمانۂ جاہلیت میں قریش کے اعیان و اکابر کو حاصل ہوا کرتا تھا۔ اس وجہ

۱۰؎ تلخیص الحبیر ۲/ ۶۲۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سے یہ حقیقت اپنے اثبات کے لیے انتخابات کی محتاج تھی نہ اس کے بارے میں کسی اختلاف ونزاع کی گنجایش تھی کہ عرب کے عام مسلمانوں کا اعتماد بہر حال قریش کو حاصل ہے اور جزیرہ نما میں کوئی دوسرا گروہ انھیں چیلنج کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ مدینہ طیبہ میں اوس وخزرج کے لیڈروں ـــــ سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ ـــــ کی قیادت میں مقامی طور پر انصار کا اثر ورسوخ مسلم تھا۔ اپنی دینی خدمات کے اعتبار سے یہ مہاجرینِ قریش سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اُنھوں نے ہجرت کی تھی تو انھوں نے غیر مشروط حمایت ونصرت کی پیش کش کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔ بدر واحد اور احزاب وحنین کے معرکوں میں یہ اُن کے پہلو بہ پہلو اسلام کے دشمنوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ مؤاخات کے زمانے میں انفاق فی سبیل اللہ کی جو مثال انھوں نے قائم کی تھی، تاریخ کے اوراق سے اس کی کوئی نظیر پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ اسلامی ریاست اگر مدینہ ہی کے حدود میں رہتی تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اقتدار ان کی طرف منتقل ہو جاتا، لیکن فتحِ مکہ کے بعد عام عربوں کے اسلام کی طرف رجوع نے سیاسی صورتِ حال میں عظیم تغیر پیدا کر دیا اور مہاجرین قریش کے مقابلے میں انصار کے سیاسی اثر ورسوخ کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔

تاہم اس کے باوجود اندیشہ تھا کہ قبائلی حمیت کا جائز اور فطری رجحان، دینی خدمات میں مسابقت کا جذبہ اور مدینہ طیبہ میں اپنی حمیت اور اثر ورسوخ پر اعتماد کہیں انھیں اقتدار کی کش مکش میں مبتلا نہ کر دے اور وہ مہاجرین قریش کو چیلنج کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ یہ صورت حال اگر خدانخواستہ پیدا ہو جاتی تو منافقین اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے اور اس وقت کے تمدنی حالات میں جنگ وجدال کے سوا فصل نزاع کی کوئی صورت تلاش کرنا ناممکن ہو جاتا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

چنانچہ اسی اندیشے کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل میں متوقع اس قضیے کو اپنی زندگی ہی میں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور رئیسِ انصار سعد بن عبادہ کی موجودگی میں لوگوں، بالخصوص انصار پر واضح کر دیا کہ 'الائمة من قریش[۱۱]' (میرے بعد امامت قریش کو منتقل ہو جائے گی)۔ لہٰذا سقیفہ بنی ساعدہ میں جب انصار کے لیڈروں نے حکومت کے لیے اپنا استحقاق ثابت کرنے کی غرض سے پر جوش تقریریں کیں تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فیصلے کا حوالہ دیا۔ آپ نے فرمایا:

لقد علمت یا سعد، ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال وانت قاعد، قریش ولاة ھذا الامر، فبر الناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم، فقال لہ سعد: صدقت، نحن الوزراء وانتم الامراء.

''اے سعد، تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے سامنے یہ بات فرمائی تھی کہ حکومت قریش کو ملے گی، اس لیے کہ عرب کے اچھے اُن کے اچھوں کے پیرو ہیں اور ان کے برے ان کے بروں کے۔ سعد نے جواب دیا: آپ نے ٹھیک کہا، ہم وزیر ہیں

۱۱؎ احمد بن حنبل، رقم ۱۲۴۸۹۔

اور آپ امیر۔'' (احمد بن حنبل، رقم ۱۹)

ایک دوسری روایت میں ان کے الفاظ ہیں:

العرب لا تعرف هذا الامر الالهذا الحی من قریش. (احمد بن حنبل، رقم ۳۹۳)

''اہل عرب اس قبیلۂ قریش کے سوا کسی اور کی قیادت سے آشنا نہیں ہیں۔''

رئیس انصار سعد بن عبادہ کی طرف سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی تصدیق کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کے حاضرین پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بحث و تمحیص کی گرما گرمی میں وہ غلط راستے پر چل پڑے تھے، دراں حالیکہ ان کے غور کرنے کا مسئلہ صرف یہ تھا کہ عام مسلمانوں کی اکثریت کے اعتماد کی بنا پر جس گروہ کو اقتدار منتقل ہوا ہے، اس کی قیادت کے لیے کس لیڈر کا انتخاب کیا جائے۔ وہ اس کے رہنماؤں میں سے جسے منتخب کریں گے، وہی مسلمانوں کا حکمران ہو گا اور ان پر اس کی اطاعت واجب ہو گی۔ انتقال اقتدار کا یہ فیصلہ ان کے رسول نے کیا ہے اور اس کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔

خلافتِ راشدہ اسی فیصلے کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ انصار کے اکابر نے جب اسے تسلیم کر لیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس یقین کی بنا پر کہ مہاجرینِ قریش کے لیڈران کی رائے سے نہ صرف یہ کہ اختلاف نہ کریں گے، بلکہ سقیفہ کی صورت حال میں ان کے اقدام کو لازماً درست قرار دیں گے۔ صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ بعد میں ایک موقع پر انھوں نے کو دا اپنے اس اقدام کا یہی سبب بیان فرمایا اور لوگوں کو تنبیہ کی کہ آیندہ کوئی شخص اسے اس باب میں قرآن مجید کے حکم ——— امرهم شوریٰ بینهم ——— کی خلاف ورزی کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرنے کی جسارت نہ کرے۔ انھوں نے فرمایا:

فلا یغترن امرؤ ان یقول: انما کانت بیعة ابی بکر فلتة وتمت، الا، وانها قد کانت کذلك، ولکن الله وقی شرها، ولیس فیکم من تقطع الاعناق الیه مثل ابی بکر۔ من بایع رجلاً من غیر مشورة من المسلمین فلا یبایع هو ولا الذی بایعه تغرة ان یقتلا۔ (بخاری، رقم ۶۸۳۰)

''تم میں سے کوئی شخص اس بات سے دھوکا نہ کھائے کہ ابوبکر کی بیعت اچانک ہوئی اور لوگوں نے اسے قبول کر لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بیعت اسی طرح ہوئی، لیکن اللہ نے اہل ایمان کو اس کے کسی برے نتیجے سے محفوظ رکھا اور یاد رکھو، تمھارے اندر اب کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ ابوبکر کی طرح جس کے سامنے گردنیں جھک جائیں۔ لہٰذا جس شخص نے اہلِ ایمان کی رائے کے بغیر کسی کی بیعت کی، اس کی اور اس سے بیعت لینے والے، دونوں کی بیعت نہ کی جائے۔ اس لیے کہ اپنے اس اقدام سے وہ گویا اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کریں گے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت بھی مہاجرینِ قریش کی یہ حیثیت برقرار تھی۔ انصار یا عرب کے کسی دوسرے گروہ نے چونکہ ان کے مقابلے میں اکثریت کا اعتماد حاصل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا، اس لیے اقتدار بدستور ان کے پاس تھا اور اس کی توثیق کے لیے عام مسلمانوں کی طرف رجوع کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ نئے امیر المومنین کی حیثیت سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو مہاجرین قریش کے لیڈر نے نامزد کیا اور ان کے اس انتخاب کو مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں ـــ انصار مہاجرین ـــ کے لیڈروں نے قبول کر لیا تو بغیر کسی انزاع کے، اسلامی دستور کے عین مطابق، امارت ان کی طرف منتقل ہوگئی۔ ابن سعد کی رویات ہے:

ان ابـابكر الصديق لما استعزبه، دعا عبد الـرحـمـن ابـن عوف فقال: اخبر نی عن عـمر بن الخطاب، فقال عبدالرحمن: ما تسـألـنـی عـن امـر الاو نت اعلم به منی، فـقـال ابـو بـكـر: و ان، فقال عبدالرحمن: هـو، والـلّـه افـضل من رأيك فيه، ثم دعا عثـمـان بـن عـفـان، فقال: اخبرنی عن عـمـر، فـقـال: انـت اخبـرنا بـه، فقال عثمان: الـلّٰهـم علمی به ان سريرته خير من علانيته، و انه ليس فينا مثله.

(الطبقات الکبریٰ ۳/ ۱۹۹)

''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر بیماری نے غلبہ پالیا اور ان کی وفات کا وقت قریب آگیا تو انھوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو بلایا اور ان سے کہا: مجھے عمر بن الخطاب کے بارے میں بتاؤ۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: آپ مجھ سے ایک ایسے معاملے کے بارے میں رائے چاہتے ہیں جسے آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ابوبکر نے فرمایا: اگرچہ (یہ درست ہے، لیکن تم اپنی رائے دو)۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا: خدا کی قسم، وہ اس رائے سے بھی بڑھ کر ہیں جو آپ ان کے بارے میں رکھتے ہیں۔ پھر انھوں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور ان سے کہا: مجھے عمر کے بارے میں بتاؤ۔ حضرت عثمان نے جواب دیا: ہم سے زیادہ آپ انھیں جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس کے باوجود، اے ابوعبداللہ، (میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں)۔ اس پر حضرت عثمان نے کہا: بے شک، میں تو یہ جانتا ہوں کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے اور ان جیسا ہمارے اندر کوئی دوسرا نہیں ہے۔''

ابن سعد بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان دونوں کے علاوہ مہاجرین و انصار کے تمام بڑے بڑے لیڈروں سے مشورہ کیا:

وشاور معهما سعيد بن زيد ابا الاعور و اسيد بن الحضير و غيرهما من المهاجرين والانصار فقال اسيد: اللهم، اعلمه الخيرة بعدك، يرضى للرضى و يسخط للسخط، الذى يسر خير من الذى يعلن، ولم يل هذا الامر احد اقوى عليه منه. (الطبقات الکبریٰ ۳/ ۱۹۹)

''اور انھوں نے ان دونوں حضرات کے ساتھ ابوالاعور سعید بن زید، اسید بن الحضیر اور ان کے علاوہ مہاجرین و انصار کے دوسرے لیڈروں سے بھی مشورہ کیا تو اسید نے کہا: بے شک، میں انھیں، اے ابوبکر، آپ کے بعد سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ وہ خوشی کے موقع پر خوش اور ناراضی کے موقع پر ناراض ہوتے ہیں۔ ان کا پوشیدہ ان کے ظاہر سے بہتر ہے۔ اس خلافت کا بوجھ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں اٹھا سکتا۔''

اس کے بعد ابن سعد نے بتایا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکر کی رائے سے اختلاف بھی کیا، لیکن انھوں نے انھیں مطمئن کر دیا۔ پھر حضرت عثمان کو بلایا اور کہا:

اکتب: بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔ ھذا ما عھد ابوبکر بن ابی قحافة اٰخر عھدہ بالدنیا خارجاً منھا، وعند اول عھدہ بالاٰخرة داخلاً فیھا، حیث یؤمن الکافر، ویوقن الفاجر، ویصدق الکاذب، انی استخلفت علیکم بعدی عمر بن الخطاب، فاسمعوا له واطیعوا. (الطبقات الکبریٰ ۳/ ۲۰۰)

''لکھیے: اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے۔ یہ ابوبکر بن ابی قحافہ کی وصیت ہے جو اس نے دنیوی زندگی کے اختتام پر، جب وہ اس سے نکلنے کو ہیں اور اخروی زندگی کے آغاز پر، جب وہ اس میں داخل ہونے کو ہیں، اس وقت کی ہے، جب کافر ایمان لاتے، فاجر یقین کرتے اور جھوٹے سچ بولتے ہیں۔ میں نے عمر بن الخطاب کو تمھارا خلیفہ بنایا ہے۔ پس ان کی سنو اور اطاعت کرو۔''

ان کے اس خط پر مہر لگائی گئی، ان کے حکم کے مطابق عمر بن الخطاب اور اسید بن سعید کی معیت میں حضرت عثمان اسے لے کر باہر تشریف لائے اور لوگوں سے کہا:

اتبایعون لمن فی ھذا الکتٰب؟ فقالوا: نعم. (الطبقات الکبریٰ ۳/ ۲۰۰)

''اس خط میں جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے، تم اس کی بیعت کرو گے؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔''

ابن سعد کی روایت ہے:

فاقروا بذلك جمیعاً، ورضوا به، و بایعوا، ثم دعا ابو بکر عمر خالیاً، فاوصاہ بما

''سب نے اقرار کیا اور اس پر راضی ہوئے اور عمر کی بیعت کی۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر کو خلوت میں بلایا

او صاہ بہ۔ (الطبقات الکبریٰ ۳/۲۰۰) اور جو نصیحت کرنا چاہی، کی۔''

عمر رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے اور رخصت کا وقت قریب آ گیا، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ عام مسلمانوں کی اکثریت کا اعتماد ابھی تک مہاجرین قریش ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ اسلامی دستور کی رو سے مسئلہ کی نوعیت اس وقت بھی یہی تھی کہ اکثریتی گروہ کو اپنے نئے لیڈر کا انتخاب کرنا تھا۔ ذمہ دار لوگوں نے خود عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ: 'الا تعہد الینا، الا تو مر علینہ'[۱۲]، (کیا آپ ہمارے لیے وصیت نہیں کریں گے، کیا آپ ہمارے لیے خلیفہ مقرر نہیں فرمائیں گے)؟ لیکن انھوں نے حضرت ابوبکر کی طرح ارکان شوریٰ کے مشورے سے خود کسی خلیفہ کا تقرر کرنے کے بجائے یہ معاملہ مہاجرینِ قریش کے چھ بڑے لیڈروں کے سپرد کر دیا اور ان سے کہا:

انی قد نظرت لکم فی امر الناس فلم اجد عند الناس، شقاقاً الا ان یکون فیکم، فان کان شقاق فھو فیکم وانما الامر الی ستۃ: الی عبد الرحمن و عثمان وعلی الزبیر وطلحۃ وسعد. (الطبقات الکبریٰ ۳/۳۴۴)

''میں نے تمھارے لیے امامت عامہ کے مسئلہ پر غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خلافت کے معاملے میں لوگوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ الّا یہ کہ وہ تم میں ہو۔ پس اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ تمھارے اندر ہی محصور ہے، لہٰذا اب یہ معاملہ تم چھ اصحاب عبدالرحمٰن، عثمان، علی زبیر، طلحہ اور سعد کے سپرد ہے۔''

ان کی اس بات کا مطلب یہ تھا کہ امارت کے لیے چونکہ لوگوں کی نظروں میں تمھارے سوا کوئی اور نہیں ہے، اس لیے تم لوگ اگر اپنے میں سے کسی ایک پر متفق ہو جاؤ گے تو وہ تمھارے اس فیصلے سے اختلاف نہ کریں گے۔

اس کے بعد انھوں نے فرمایا: 'قوموا فتشاوروا فامروا احدکم'[۱۳] (اٹھو، مشورہ کرو اور اپنے میں سے کسی کو امیر بنالو)۔ تاہم چونکہ اندیشہ تھا کہ شر پسند شورش برپا کرنے کی کوشش کریں یا یہ حضرات مشاورت کو ضرورت سے زیادہ طویل کر دیں، اس لیے آپ نے انصار کو جو اقلیتی گروہ ہونے کی وجہ سے اس قضیے سے الگ تھے، ان پر نگران مقرر کر دیا۔ ابنِ سعد انس بن مالک کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

ارسل عمر بن الخطاب الی ابی طلحۃ الانصاری قبل ان یموت بساعۃ فقال: یا ابا طلحۃ، کن فی خمسین من قومك من الانصار مع ھولاء النفر: اصحاب

''عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے وفات سے ذرا پہلے ابو طلحہ انصاری کو بلایا۔ وہ آئے تو فرمایا: ابوطلحہ، اپنی قوم، انصار کے پچاس آدمی لے کر ان اصحاب شوریٰ کے پاس پہنچ جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ یہ اپنے میں سے کسی کے گھر پر

۱۲؎ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۳/۳۴۳۔

۱۳؎ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۳/۳۴۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الشوریٰ، فانهم فیما احسب سیجتمعون فی بیت احد هم، فقم علی ذلك الباب باصحابك، فلا تترك احداً یدخل علیهم، ولا تترکهم یمضی الیوم الثالث حتی یومروا احد هم.	جمع ہوں گے۔ لہٰذا تم اپنے ساتھیوں کو لے کر دروازے پر کھڑے ہو جاؤ اور نہ کسی کو اندر داخل ہونے دو، نہ انھیں انتخاب امارت کے لیے تین دن سے زیادہ کی مہلت دو۔''

(الطبقات الکبریٰ ۳/۳۶۴)

انصار کے اربابِ حل وعقد کے بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو ہدایت کی کہ:

احضروا معکم من شیوخ الانصار، ولیس لهم من امرکم من شئی.	''انصار کے لیڈروں کو اپنے ساتھ بلالو، لیکن تمھاری اس امارت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔''

(الامامتہ والسیاسہ، ابن قتیبہ ۲۸)

ابن سعد کی روایت ہے کہ یہ سب جمع ہوئے تو عبدالرحمٰن بن عوف نے ان میں سے تین کو تین کے حق میں دست بردار ہونے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ زبیر علی کے حق میں اور طلحہ وسعد، عثمان اور عبدالرحمٰن کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ پھر انھوں نے علی وعثمان سے کہا کہ وہ اس معاملے کا فیصلہ ان کے سپرد کر دیں۔ وہ دونوں راضی ہو گئے تو علی رضی اللہ عنہ سے کہا:

ان لك من القرابة من رسول الله صلی اللّٰه علیه وسلم والقدم، واللّٰه علیك لئن استخلفت لتعدلن، ولئن استخلف عثمان لتسمعن ولتطیعن.	''تمھیں دین میں سبقت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کا شرف حاصل ہے۔ خدا گواہ رہے کہ اگر خلافت تمھارے سپرد ہوئی تو وعدہ کرو کہ عدل کرو گے اور اگر عثمان خلیفہ بنا دیے گئے تو ان کے ساتھ سمع وطاعت کا رویہ اختیار کرو گے۔''

(الطبقات الکبریٰ ۳/ ۳۳۹)

حضرت علی نے اقرار کیا تو انھوں نے یہی بات عثمان رضی اللہ عنہ سے کہی۔ وہ بھی راضی ہو گئے تو فرمایا: عثمان اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا تو حضرت علی اور دوسرے لوگوں نے بیعت کر لی۔[14]

علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن یہ اختلاف آرا کسی بنیادی اصول کے بارے میں نہیں، صرف اس بات میں ہے کہ قریش کے سب لیڈر کیا ان کے انتخاب کے موقع پر جمع ہوئے اور ان کا انتخاب کیا انھوں نے اپنی آزادانہ مرضی سے کیا یا اس میں جبر واکراہ کو بھی کچھ دخل تھا؟ یہ بحث ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے، اس لیے اس سے قطعِ نظر بھی کر لیا جائے تو یہ حقیقت اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ خلافتِ راشدہ کے پورے دور میں اقتدار بہرحال اکثریتی گروہ،

۱۴؎ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۳/ ۳۳۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یعنی مہاجرین قریش کے پاس رہا اور ان کے بڑے بڑے لیڈر باہمی مشورے سے امامتِ عامہ کے لیے مختلف اشخاص کا انتخاب کرتے رہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ چاروں خلفاء کے انتخاب کے لیے الگ الگ طریقے اختیار نہیں کیے گئے، بلکہ اصولی اعتبار سے ایک ہی طریقے کی پیروری کی گئی۔ یہ سب اکثریتی گروہ کے اکابر میں سے منتخب کیے گئے اور ان کا انتخاب تمام گروہوں کے اکابر کے مشورے سے ہوا۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ پر وہ متفق ہو گئے تو حضرت ابوبکر نے ان کا فیصلہ خود نافذ کر دیا اور حضرت عمر نے ان کی رائے کو مختلف، لیکن چھ بڑے لیڈروں ہی میں محصور پایا تو ان کے اس فیصلے کا اعلان خود کر دیا اور ان چھ میں سے ایک کے انتخاب کی ذمہ داری خود ان چھ اشخاص پر ڈال دی۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد عمار خان ناصر

ارض فلسطین پر یہود کا حق

صحف سماوی کی تصریحات اور عالم اسلام کا حالیہ موقف

اگر ایسے مسائل کی فہرست تیار کی جائے جنھوں نے اس وقت سیاسی، مذہبی اور نفسیاتی لحاظ سے پورے عالم اسلام کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے تو ان میں مسئلۂ فلسطین سر فہرست ہو گا۔ انیسویں صدی کے آخر میں صیہونی تحریک کی جانب سے فلسطین میں یہودیوں کی دوبارہ آباد کاری (Re-settlement) کی ابتدائی کوششوں سے لے کر امریکی حکومت کے حالیہ روڈ میپ تک، ہر مرحلے پر عرب دنیا کو پہلے سے زیادہ پسپائی اختیار کرنا پڑی ہے۔ اگرچہ عالم اسلام کے عوامی اور مذہبی حلقوں میں ابھی تک اسرائیل کے حوالے سے اس جارحانہ موقف ہی کو پزیرائی حاصل ہے جس کی ترجمانی، مثال کے طور پر، 'حماس' کرتی رہی ہے، لیکن معروضی حالات نے کم از کم عرب حکومتوں اور فلسطین کی سیاسی قیادت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اسرائیل کے قیام اور اس کے وجود کو ایک حقیقت واقعہ کے طور پر تسلیم کر لیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ جب تک کہ فریقین پر امن بقاے باہمی (Peaceful Co-existence) کے اصول کو پوری ذہنی آمادگی کے ساتھ تسلیم نہ کر لیں، حالات کے جبر کے تحت اختیار کیا جانے والا رویہ کسی پائدار حل کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ اس ذہنی آمادگی کے پیدا ہونے میں جہاں باہمی قتل و غارت اور خون ریزی کا ایک طویل تسلسل مانع ہے، وہاں کچھ مذہبی اور سیاسی تصورات بھی اس کی راہ میں حائل ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم رائے عامہ میں اس تصور کو فروغ عام حاصل ہے کہ یہود کا اس سر زمین کے ساتھ نہ کوئی تاریخی یا مذہبی تعلق ہے اور نہ اس بنیاد پر یہاں آباد ہونے کی ان کی خواہش کو کوئی جائز بنیاد حاصل ہے۔ ان کے خیال میں یہودی ریاست کا قیام محض عالمی طاقتوں کے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے کیا گیا ہے۔ اس قسم کے تصورات کی موجودگی میں امن اور بقاے باہمی کی فضا جس حد تک فروغ پا سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک اس باب میں بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مبنی بر خطا تصورات کی اصلاح کی جائے جو جذباتی اور غیر ذمہ دارانہ رہنمائی کے نتیجے میں امت مسلمہ میں جڑ پکڑ چکے ہیں۔ اس ضمن میں مسجد اقصیٰ کی تولیت

کے معاملے پر، جو ایک بنیادی نوعیت کا سوال ہے، ہم اپنی ایک سابقہ تحریر میں تفصیلاً روشنی ڈال چکے ہیں[1]۔ زیرِ نظر تحریر میں سرزمین فلسطین کے ساتھ یہود کے تعلق اور وابستگی کے مذہبی و تاریخی پس منظر اور اس حوالے سے امت مسلمہ کے حالیہ موقف پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

تورات کے بیانات

تورات میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اہل و عیال سمیت اُور سے نکل کر کنعان کی طرف، جو فلسطین کا قدیم تاریخی نام ہے، ہجرت کرنے کا حکم دیا تو ان سے وعدہ کیا کہ وہ یہ سرزمین ان کی اولاد کو عطا کرے گا:

''اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور بابرکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ ...اور وہ ملک کنعان کو روانہ ہوئے اور ملک کنعان میں آئے۔ اور ابرام اس ملک میں سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔''
(پیدایش ۱۲: ۱۔۷)

تورات ہی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس موعودہ سرزمین کے حدود اربعہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتا دینے کے ساتھ ساتھ اس کے حصول کی الٰہی اسکیم بھی ان پر واضح فرما دی تھی:

''اور اس نے ابرام سے کہا، یقین جان کہ تیری نسل کے لوگ ایسے ملک میں جو ان کا نہیں، پردیسی ہوں گے اور وہاں کے لوگوں کی غلامی کریں گے اور وہ چار سو برس تک ان کو دکھ دیں گے، لیکن میں اس قوم کی عدالت کروں گا جس کی وہ غلامی کریں گے اور بعد میں وہ بڑی دولت لے کر وہاں سے نکل آئیں گے اور تو صحیح سلامت اپنے باپ دادا سے جا ملے گا اور نہایت پیری میں دفن ہوگا اور وہ چوتھی پشت میں یہاں لوٹ آئیں گے، کیونکہ اموریوں کے گناہ اب تک پورے نہیں ہوئے۔ ....اسی روز خداوند نے ابرام سے عہد کیا اور فرمایا کہ یہ ملک دریاے مصر سے لے کر اس بڑے دریا یعنی دریاے فرات تک قینیوں اور قنیزیوں اور قدمونیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور رفائیم اور اموریوں اور کنعانیوں اور جرجاسیوں اور یبوسیوں سمیت میں نے تیری اولاد کو دیا ہے۔'' (پیدایش ۱۵: ۱۳۔۲۱)

اس وعدے کی یاددہانی حضرت اسحاق علیہ السلام[2] اور حضرت یعقوب علیہ السلام[3] کو بھی کرائی گئی۔ مصر میں حضرت یوسف

---

[1] دیکھیے: اشراق، جولائی، اگست ۲۰۰۳ء۔

[2] پیدایش ۲۶: ۲۔۳۔

علیہ السلام کی بادشاہت کے زمانے میں جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی ساری اولاد کے ساتھ ہجرت کر کے وہاں تشریف لے گئے تو انھوں نے وصیت کی کہ انھیں مصر کے بجائے سر زمین کنعان ہی میں دفن کیا جائے۔[۴] وفات کے وقت انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس الٰہی وعدے کی یاد دہانی کراتے ہوئے فرمایا:

''میں تو مرتا ہوں، لیکن خدا تمھارے ساتھ ہوگا اور تم کو پھر تمھارے باپ دادا کے ملک میں لے جاؤں گا۔''

(پیدایش ۴۸: ۲۱)

مصریوں کی غلامی میں کئی صدیاں گزارنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل میں مبعوث کیا تو انھیں بھی اس وعدے کی یاد دہانی کرائی۔[۵] مصر سے خروج کے وقت حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو خدا کا یہ عہد یاد دلایا۔[۶] بنی اسرائیل جب بیابان میں مقیم تھے تو خدا تعالیٰ نے انھیں شریعت عطا کی اور وہ منصوبہ بھی ان پر واضح فرمایا جس کے مطابق ارض موعودہ بنی اسرائیل کو عطا کی جانی تھی:

''میں اپنی ہیبت کو تیرے آگے آگے بھیجوں گا اور میں ان سب لوگوں کو جن کے پاس تو جائے گا، شکست دوں گا اور میں ایسا کروں گا کہ تیرے سب دشمن تیرے آگے اپنی پشت پھیر دیں گے۔ میں تیرے آگے زنبوروں کو بھیجوں گا جو حوی اور کنعانی اور حتی کو تیرے سامنے سے بھگا دیں گے۔ میں ان کو ایک ہی سال میں تیرے آگے سے دور نہیں کروں گا تا نہ ہو کہ زمین ویران ہو جائے اور جنگلی درندے زیادہ ہو کر تجھے ستانے لگیں، بلکہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے ان کو تیرے سامنے سے دور کرتا رہوں گا، جب تک تو شمار میں بڑھ کر ملک کا وارث نہ ہو جائے۔ میں بحر قلزم سے لے کر فلستیوں کے سمندر تک اور بیابان سے لے کر نہر فرات تک تیری حدیں باندھوں گا، کیونکہ میں اس ملک کے باشندوں کو تمھارے ہاتھ میں کر دوں گا اور تو ان کو اپنے آگے سے نکال دے گا۔'' (خروج ۲۳: ۲۷۔ ۳۱)

احکام شریعت کی تشریح اور اجتماعی زندگی کے حدود و قیود کی وضاحت کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ ارض موعودہ پر قبضے کے لیے بنی اسرائیل کو لے کر روانہ ہوں۔[۷] موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کے ہر قبیلے میں سے ایک ایک آدمی کو منتخب کیا اور انھیں ملک کنعان کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ چالیس دن کے بعد جب وہ لوٹے تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بتایا:

۳؎ پیدایش ۲۸: ۱۳۔ ۳۵: ۱۲۔

۴؎ پیدایش ۴۷: ۲۹۔ ۳۰۔

۵؎ خروج ۳: ۸۔ ۵: ۴۔

۶؎ خروج ۱۳: ۵۔

۷؎ خروج ۳۳: ۱۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

”جس ملک میں تو نے ہم کو بھیجا تھا، ہم وہاں گئے اور واقعی دودھ اور شہد اس میں بہتا ہے اور یہ وہاں کا پھل ہے، لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں، وہ زور آور ہیں اور ان کے شہر بڑے بڑے اور فصیل دار ہیں اور ہم نے بنی عناق کو بھی وہاں دیکھا۔ اس ملک کے جنوبی حصہ میں تو عمالیقی آباد ہیں اور حتی اور یبوسی اور اموری پہاڑوں پر رہتے ہیں اور سمندر کے ساحل پر اور یزدن کے کنارے کنارے کنعانی بسے ہوئے ہیں۔“ (گنتی ۱۳: ۲۷۔ ۲۹)

بارہ کے گروہ میں سے کالب اور یشوع کے سوا باقی تمام افراد کنعان میں بسنے والی قوموں کی طاقت اور قوت سے سخت مرعوب تھے اور ان کی اس کیفیت کی وجہ سے بنی اسرائیل بھی من حیث المجموع ہمت ہار گئے اور ارض موعودہ پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا:

”تب کالب نے موسیٰ کے سامنے لوگوں کو چپ کرایا اور کہا کہ چلو ہم ایک دم جا کر اس پر قبضہ کر لیں، کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کر لیں۔ لیکن جو اور آدمی اس کے ساتھ گئے تھے، وہ کہنے لگے کہ ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں، کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔ ان آدمیوں نے بنی اسرائیل کو اس ملک کی جسے وہ دیکھنے گئے تھے، بری خبر دی اور وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے، وہ سب بڑے قد آور ہیں اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔ تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی، ہائے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے! یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے! خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھیریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔ پھر وہ آپس میں کہنے لگے آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنا لیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔“

(گنتی ۱۳: ۲۷ تا ۳۳۔ ۱۴: ۱۔ ۴)

اس پست ہمتی اور بزدلی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی:

”تمھاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمھاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے، ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا، جانے نہ پائے گا سوا یفنہ کے بیٹے کالب کے اور نون کے بیٹے یشوع کے۔ اور تمھارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھیریں گے، ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا، وہ اس کی حقیقت پہچانیں گے۔ اور تمھارا حال یہ ہوگا کہ تمھاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی۔“ (گنتی ۱۴: ۲۹۔ ۳۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات تک بنی اسرائیل ارض موعود کے اردگرد بسنے والی مختلف اقوام سے لڑتے اور ان کے علاقوں پر قابض ہوتے رہے۔ وفات سے قبل موسیٰ علیہ السلام نے ارض موعود سے متعلق خدائی احکام و ہدایات تفصیل کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساتھ بنی اسرائیل کو بتا دیے۔ ان میں سے اہم تر درج ذیل ہیں:

۱۔ موعودہ سرزمین کے حدود کی مفصل تعیین

''پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ بنی اسرائیل کو حکم کر اور ان کو کہہ دے کہ جب تم ملک کنعان میں داخل ہو (یہ وہی ملک ہے جو تمھاری میراث ہو گا، یعنی کنعان کا ملک مع اپنی حدود اربعہ کے) تو تمھاری جنوبی سمت دشت صین سے لے کر ملک ادوم کے کنارے کنارے ہو اور تمھاری جنوبی سرحد دریائے شور کے آخر سے شروع ہو کر مشرق کو جائے۔ وہاں سے تمھاری سرحد عقربیم کی چڑھائی کے جنوب تک پہنچ کر مڑے اور صین سے ہوتی ہوئی قادس برنیع کے جنوب میں جا کر نکلے اور حصر ادار سے ہو کر عضمون تک پہنچے۔ پھر یہی سرحد عضمون سے ہو کر گھومتی ہوئی مصر کی نہر تک جائے اور سمندر کے ساحل پر ختم ہو۔ اور مغربی سمت میں بڑا سمندر اور اس کا ساحل ہو۔ سو یہی تمھاری مغربی سرحد ٹھہرے۔ اور شمالی سمت میں تم بڑے سمندر سے کوہ ہور تک اپنی حد رکھنا۔ پھر کوہ ہور سے حمات کے مدخل تک تم اس طرح اپنی حد مقرر کرنا کہ وہ صداد سے جا ملے۔ اور وہاں سے ہوتی ہوئی زفرون کو نکل جائے اور حصر عینان پر جا کر ختم ہو۔ یہ تمھاری شمالی سرحد ہو۔ اور تم اپنی مشرقی سرحد حصر عینان سے لے کر سفام تک باندھنا اور یہ سرحد سفام سے ربلہ تک جو عین کے مشرق میں ہے، جائے اور وہاں سے نیچے کو اترتی ہوئی کنرت کی جھیل کے مشرقی کنارے تک پہنچے۔ اور پھر یردن کے کنارے کنارے نیچے کو جا کر دریائے شور پر ختم ہو۔ ان حدود کے اندر تمھارا ملک ہو گا۔'' (گنتی ۳۴: ۱۔ ۱۲)

۲۔ وہاں بسنے والی اقوام کے مکمل اخراج کا حکم

''بنی اسرائیل سے یہ کہہ دے کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہو تو تم اس ملک کے سب باشندوں کو وہاں سے نکال دینا اور ان کے شبیہ دار پتھروں کو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے سب اونچے مقاموں کو مسمار کر دینا اور تم اس ملک پر قبضہ کر کے اس میں بسنا، کیونکہ میں نے وہ ملک تم کو دیا ہے کہ تم اس کے مالک بنو... لیکن اگر تم اس ملک کے باشندوں کو اپنے آگے سے دور نہ کرو تو جن کو تم باقی رہنے دو گے، وہ تمھاری آنکھوں میں خار اور تمھارے پہلووں میں کانٹے ہوں گے اور اس ملک میں جہاں تم بسو گے، تم کو دق کریں گے۔ اور آخر کو یوں ہو گا کہ جیسا میں نے ان کے ساتھ کرنے کا ارادہ کیا، ویسا ہی تم سے کروں گا۔'' (گنتی ۳۳: ۵۱۔ ۵۶)

۳۔ بارہ قبائل میں زمین کی تقسیم کا حکم

''اور تم قرعہ ڈال کر اس ملک کو اپنے گھرانوں میں میراث کے طور پر بانٹ لینا۔ جس خاندان میں زیادہ آدمی ہوں، اس کو زیادہ اور جس میں تھوڑے ہوں، اس کو تھوڑی میراث دینا اور جس آدمی کا قرعہ جس جگہ کے لیے نکلے، وہی اس کو حصہ میں ملے۔ تم اپنے آبائی قبائل کے مطابق اپنی اپنی میراث لینا۔'' (گنتی ۳۳: ۵۴)

۴۔ وعدے کی مشروط نوعیت کی وضاحت

''اور جب تجھ سے بیٹے اور پوتے پیدا ہوں اور تم کو اس ملک میں رہتے ہوئے ایک مدت ہو جائے اور تم بگڑ کر کسی چیز کی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شبیہ کی کھودی ہوئی مورت بنا لو خداوند اپنے خدا کے حضور شرارت کر کے اسے غصہ دلاؤ تو میں آج کے دن تمھارے برخلاف آسمان اور زمین کو گواہ بناتا ہوں کہ تم اس ملک سے جس پر قبضہ کرنے کو یردن پار جانے پر ہو جلد بالکل فنا ہو جاؤ گے۔ تم وہاں بہت دن رہنے نہ پاؤ گے، بلکہ بالکل نابود کر دیے جاؤ گے اور خداوند تم کو قوموں میں تتر بتر کرے گا اور جن قوموں کے درمیان خداوند تم کو پہنچائے گا، ان میں تم تھوڑے سے رہ جاؤ گے۔ اور وہاں تم آدمیوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے لکڑی اور پتھر کے دیوتاؤں کی عبادت کرو گے جو نہ دیکھتے نہ سنتے نہ کھاتے نہ سونگھتے ہیں، لیکن وہاں بھی اگر تم خداوند اپنے خدا کے طالب ہو تو وہ تجھ کو مل جائے گا، بشرطیکہ تو اپنے پورے دل سے اور اپنی ساری جان سے اسے ڈھونڈے۔ جب تو مصیبت میں پڑے گا اور یہ سب باتیں تجھ پر گزریں گی تو آخری دنوں میں تو خداوند اپنے خدا کی طرف پھرے گا اور اس کی مانے گا، کیونکہ خداوند تیرا خدا رحیم خدا ہے۔ وہ تجھ کو نہ چھوڑے گا اور نہ ہلاک کرے گا اور نہ اس عہد کو بھولے گا جس کی قسم اس نے تیرے باپ دادا سے کھائی۔'' (استثنا ۴: ۲۵۔۳۱)

''اور جب یہ ساری باتیں یعنی برکت اور لعنت جن کو میں نے آج تیرے آگے رکھا ہے، تجھ پر آئیں اور تو ان قوموں کے بیچ جن میں خداوند تیرے خدا نے تجھ کو ہنکا کر پہنچا دیا ہو، ان کو یاد کرے اور تو اور تیری اولاد، دونوں خداوند اپنے خدا کی طرف پھریں اور اس کی بات ان سب احکام کے مطابق جو میں آج تجھ کو دیتا ہوں، اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان سے مانیں تو خداوند تیرا خدا تیری اسیری کو پلٹ کر تجھ پر رحم کرے گا اور پھر کر تجھ کو سب قوموں میں سے جن میں خداوند تیرے خدا نے تجھ کو پراگندہ کیا ہو جمع کرے گا۔ اگر تیرے آوارہ گرد دنیا کے انتہائی حصوں میں بھی ہوں تو وہاں سے بھی خداوند تیرا خدا تجھ کو جمع کر کے لے آئے گا اور خداوند تیرا خدا اسی ملک میں تجھ کو لائے گا جس پر تیرے باپ دادا نے قبضہ کیا تھا اور تو اس کو اپنے قبضے میں لائے گا۔'' (استثنا ۳۰: ۱۔۵)

تورات کے ان بیانات سے واضح ہے کہ:

۱۔ فلسطین کی سرزمین اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بطور وراثت اور ملکیت عنایت کی تھی۔

۲۔ اس پر قبضے اور اس میں پہلے سے بسنے والی اقوام کے اخراج کے لیے ان کی جنگ حکم الٰہی کے ماتحت تھی۔

۳۔ بداعمالیوں کے نتیجے میں اس سرزمین سے بنی اسرائیل کی جلاوطنی ان کے تعلق کی تنسیخ کے طور پر نہیں، بلکہ تنبیہ و توبیخ اور اصلاح احوال کا موقع فراہم کرنے کے لیے تھی۔

قرآن مجید کی تصریحات

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو وہ صراحتاً ان تمام بیانات کی تصدیق کرتا ہے، چنانچہ اس کی آیات سے حسب ذیل امور بالکل واضح ہیں:

سرزمین فلسطین بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وراثت کے طور پر عطا کی گئی تھی اور اس میں ان کا آباد ہونا اللہ کے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

خاص فضل و احسان کا نتیجہ تھا:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ لا بِمَاصَبَرُوْا. (الاعراف ۷: ۱۳۷)

”اور ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور سمجھے جاتے تھے، اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وراثت بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے۔ اور تیرے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر و استقامت کی وجہ سے پورا ہو گیا۔“

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ. (یونس ۱۰: ۹۳)

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا رہنے کو دیا اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا۔“

اس سرزمین پر قبضے کے لیے بنی اسرائیل کی جنگیں 'قتال فی سبیل اللہ' تھیں اور اس سے روگردانی ان کی بزدلی اور حکم عدولی کا مظہر تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دور میں بنی اسرائیل کو اس حوالے سے جہاد کی جو ترغیب دی، اس کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ. يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ. (المائدہ ۵: ۲۰۔ ۲۱)

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم، اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں سے پیغمبر بنائے اور تمھیں بادشاہ بنا دیا اور تمھیں وہ کچھ دیا جو تمام عالم میں کسی کو نہیں دیا۔ اے میری قوم، اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے نام لکھ دی ہے اور پشت پھیر کر روگردانی نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ پھر نقصان میں جا پڑو۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جب بنی اسرائیل نے دشمنوں کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا تو اس بزدلی کی پاداش میں اس سرزمین میں ان کا داخلہ چالیس سال کے لیے موخر کر دیا گیا:

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ. (المائدہ ۵: ۲۶)

”اللہ نے فرمایا کہ اب یہ سرزمین چالیس سال کے لیے ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ یہ زمین میں سرگرداں ادھر ادھر پھرتے رہیں گے، اس لیے تم ان فاسقوں کے بارے میں غمگین نہ ہونا۔“

یوشع بن نون علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل شہر کو فتح کر کے اس میں داخل تو ہو گئے، لیکن اپنی ایمانی و اخلاقی

کمزوری کے باعث وہاں کی کافر قوموں کو پوری طرح نیست ونابود نہ کر سکے۔ ایک طویل عرصے کی پست ہمتی کے بعد سیدنا سموئیل علیہ السلام کے زمانے میں وہ ارض مقدسہ پر مکمل قبضہ کی غرض سے دوبارہ جہاد کے لیے آمادہ ہوئے اور طالوت اور حضرت داؤد کی قیادت میں انھوں نے فلستی قوم کے ساتھ جنگ کی۔ سورۂ بقرہ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡ بَعۡدِ مُوۡسٰیۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِؕ قَالَ هَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡاؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا وَاَبۡنَآئِنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡهُمۡ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ. (البقرہ ۲:۲۴۶)

''کیا آپ نے موسیٰ کے زمانے کے بعد بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال نہیں دیکھا جب انھوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ بنا دیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ ممکن ہے جہاد فرض ہو جانے کے بعد تم جہاد نہ کرو۔ انھوں نے کہا، بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے، جبکہ ہم اپنے گھروں سے اجاڑے گئے اور بچوں سے دور کیے گئے ہیں؟ پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو سوائے چند لوگوں کے باقی سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔''

وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِیۡنَ. فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُؕ وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ.

(البقرہ ۲: ۲۵۰۔۲۵۱)

''اور جب ان کا جالوت اور اس کے لشکر سے آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے دعا کی کہ یا اللہ ہمیں صبر اور ثابت قدمی عنایت فرما اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انھوں نے ان کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے ان کو بادشاہت اور حکمت اور جتنا چاہا، علم بھی عطا کیا۔ اور اگر اللہ انسانوں (کے فتنہ وفساد) کو انسانوں ہی کے ذریعے سے دور نہ کرے تو زمین فساد سے بھر جائے، لیکن اللہ دنیا والوں پر فضل کرنے والا ہے۔''

بنی اسرائیل پر اللہ کے احکام سے روگردانی کی صورت میں تعذیب اور ظنی کا، جبکہ اصلاح احوال کی صورت میں اللہ کی رحمت کے دوبارہ متوجہ ہونے کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا:

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبۡعَثَنَّ عَلَیۡهِمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ مَنۡ یَّسُوۡمُهُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِؕ اِنَّ

''اور جب تمھارے رب نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ بنی اسرائیل پر قیامت تک ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رَبَّكَ لَسَرِيۡعُ الۡعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ . وَقَطَّعۡنٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اُمَمًا مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰلِكَ وَبَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ .

(الاعراف ۷: ۱۶۷۔۱۶۸)

ان کو سخت عذاب چکھائیں گے۔ بلاشک تیرا رب جلدی سزا دینے والا ہے اور بے شبہ وہ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا بھی ہے۔ اور ہم نے ان کو دنیا میں تتر بتر کر دیا۔ ان میں کچھ نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو خوش حالی اور بدحالی سے آزماتے رہے تاکہ وہ باز آجائیں۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں فلسطین سے بنی اسرائیل کی دو مشہور جلاوطنیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ہے:

عَسٰی رَبُّكُمۡ اَنۡ يَّرۡحَمَكُمۡ وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا وَجَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ حَصِيۡرًا .

(بنی اسرائیل ۱۷: ۸)

''توقع ہے کہ تمھارا رب تم پر پھر رحم کرے گا۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ یہی رویہ اپنایا تو ہم بھی یہی کچھ کریں گے۔ اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ دوبارہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا:

يٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ وَاِيَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ . (البقرہ ۲: ۴۰)

''اے بنی اسرائیل، میرے ان احسانات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے اور میرے ساتھ کیا ہوا عہد پورا کرو، میں تمھارے ساتھ کیے ہوئے عہد کو پورا کروں گا اور بس مجھ ہی سے ڈرو۔''

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

اس ضمن میں قرآن مجید نے یہ بات البتہ واضح فرما دی ہے کہ بنی اسرائیل کو اب قیامت تک پہلے کی طرح آزادی، استقلال اور خود مختاری حاصل نہیں ہوگی، بلکہ وہ ہمیشہ سیدنا مسیح علیہ السلام پر ایمان رکھنے والوں کے تابع رہیں گے اور دنیا میں ان کو جب بھی اور جس قدر بھی راحت و اطمینان نصیب ہوگا، متبعین مسیح ہی کے زیر سایہ نصیب ہوگا:

اِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَجَاعِلُ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡكَ فَوۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰی يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ . (آل عمران ۳: ۵۵)

''جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے عیسیٰ، میں تجھے وفات دوں گا، اور تجھے اپنی جانب اٹھا لوں گا، اور تجھے ان کافروں کے شر سے نجات دوں گا، اور تیرے تابع داروں کو قیامت تک تیرا انکار کرنے والوں پر غالب رکھوں گا۔''

ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ .

(آل عمران ۳: ۱۱۲)

''ان پر ہر جگہ ذلت کی مار پڑی، الاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی یا لوگوں کی پناہ میں ہوں۔''

امت مسلمہ کا حالیہ موقف

صحف آسمانی کی مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں سرزمین فلسطین کے ساتھ یہود کے مذہبی و تاریخی تعلق اور اس بنیاد پر اس کے ساتھ ان کی قلبی وابستگی کی نوعیت بالکل واضح ہے، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ صیہونی تحریک کے دعووں کے جواب میں امت مسلمہ اب قریب قریب اجتماعی طور پر اس بنیادی حقیقت ہی سے انکار کا راستہ اختیار کر چکی ہے کہ یہود اس سرزمین پر کبھی جائز طور پر قابض ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ان کی وابستگی اور اس میں دوبارہ آباد ہونے کی خواہش کو مذہبی یا تاریخی لحاظ سے کوئی جائز بنیاد حاصل ہے۔ یہودی ریاست کے قیام کے لیے صیہونی کوششوں کے جواب میں امت مسلمہ کا استدلال اگر معروضی حالات کی ناموافقت تک محدود رہتا اور یہ کہا جاتا کہ زمینی حقائق کی روشنی میں اس قسم کی کسی ریاست کا قیام موجودہ عرب آبادی کی حق تلفی اور خطے میں سیاسی خلفشار اور کشمکش پیدا کیے بغیر ممکن نہیں تو اس موقف میں مذہبی یا اخلاقی لحاظ سے کوئی قباحت نہیں تھی، لیکن استدلال یہاں تک محدود نہیں رہا، بلکہ مسئلے کا حل یہ ڈھونڈا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ ارض مقدس کی وراثت کے خدائی وعدے ہی کو سرے سے لپیٹ دیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ فلسطین تو اصل میں صدیوں سے عربوں کا ملک ہے، یہودی تو درمیان میں محض ایک محدود عرصے کے لیے غاصبانہ طور پر اس پر قابض ہوئے تھے، لیکن عربوں نے مزاحمت کر کے ان کو یہاں سے نکال باہر کیا، لہٰذا اس سرزمین پر کسی قسم کے تاریخی یا مذہبی حق کا یہودی دعویٰ ہی سرے سے بے بنیاد اور باطل ہے۔ عرب ممالک سرکاری سطح پر اس وقت یہی موقف اختیار کیے ہوئے ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل الدکتور عبداللہ بن صالح العبید نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے:

> ''تاریخی دستاویزات کی رو سے القدس ایک خالص عربی شہر ہے جس کو تاریخ کے آغاز ہی سے نہایت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کو کنعانیوں اور یبوسیوں نے آباد کیا تھا جو کہ عرب تھے۔...... قدیم تاریخ میں اگر القدس کو دوسری اقوام کے حملوں کا سامنا رہا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ملکیت کا حق حملہ آوروں کو منتقل ہو گیا۔ یہ شہر قبل از اسلام تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قوموں کی حرص وطمع کا نشانہ بنا رہا۔ اسرائیل اس میں بارھویں سدی قبل مسیح میں داخل ہوئے۔ پھر ۵۸۶ ق م میں ایرانی اس پر حملہ آور ہوئے۔ ۳۳۲ میں اسکندر مقدونی نے اس پر قبضہ کر لیا جبکہ ۷۰ء میں یہ رومی عیسائیوں کے زیر تسلط آ گیا۔ لیکن اس کے عرب باسی ہر مرتبہ حملہ آوروں کو نکال باہر کرتے رہے تاکہ یہ شہر ایک خالص عربی شہر ہی رہے۔... اس زمانے میں یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ القدس ایک عبرانی شہر ہے، ان تاریخی دستاویزات کو نظر انداز کرنے پر مبنی ہے جو ثابت کرتی ہیں کہ القدس کا ایک شہر کے طور پر ظہور برونزی عہد کے آغاز میں ہوا جب کنعانیوں نے اس کی تعمیر کی۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آثار قدیمہ کے انکشافات اور تاریخی مآخذ کے مطابق فلسطین میں عربوں کی تاریخ چھ ہزار سال پرانی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں عربوں کا وجود اسرائیلیوں کے حملے سے ۲۶۰۰ سال مقدم ہے۔ اس سے وہ تمام یہودی

دعوے خاک میں مل جاتے ہیں جن کے مطابق القدس اور فلسطین یہود کی ملکیت ہیں، حالانکہ قدیم تاریخ میں القدس پر یہودیوں کی حکومت مسلسل ۷۰ سال سے زیادہ کبھی نہیں رہی۔''

(ہفت روزہ ''العالم الاسلامی'' ملف خاص، ۱۵۔۲۱ فروری ۱۹۹۹ء، ۳)

اس موقف کو بعض جید علماے دین اور مفتیان شرع متین نے بھی پزیرائی بخشی ہے۔ دنیاے عرب کے نامور عالم الشیخ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں:

''اگر ان تمام سالوں کو جمع کیا جائے جو یہودیوں نے حملے کرتے اور تباہی پھیلاتے ہوئے فلسطین میں گزارے تو اتنی مدت بھی نہیں بنے گی جتنی انگریز نے ہندوستان میں یا ہالینڈیوں نے انڈونیشیا میں گزاری۔ اگر اتنی مدت گزارنے پر کسی کو کسی سرزمین پر تاریخی حق حاصل ہو جاتا ہے تو انگریزوں اور ہالینڈیوں کو بھی اس قسم کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اور اگر غربت کی حالت میں ایک طویل عرصہ کسی علاقے میں گزارنے سے اس زمین پر ملکیت کا حق ثابت ہوتا ہے تو پھر یہودیوں کو چاہیے کہ وہ فلسطین کے بجائے، جس میں ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد نے تقریباً ۲۰۰ سال گزارے اور جہاں وہ دو افراد آئے تھے، لیکن ۷۰ افراد نکل کر گئے، مصر کی ملکیت کا مطالبہ کریں جس میں انھوں نے ۴۳۰ سال گزارے۔...... یہودیوں کا فلسطین پر تاریخی حق کا دعویٰ بالکل لغو ہے۔ صحیفوں کے تصریح کے مطابق وہ یہاں محض اجنبیوں کی طرح رہے۔ تو کیا کسی پردیسی یا راہ گیر کو یہ حق ہے کہ وہ اس زمین پر جس نے اس کو ذرا پناہ دے دی یا اس درخت پر جس نے اس کو تھوڑی دیر سایہ فراہم کر دیا، اس وجہ سے ملکیت کا حق جتا دے کہ اس نے گھڑی کی گھڑی وہاں ستا لیا ہے؟''

(ہفت روزہ الدعوۃ، الریاض، ۱۱ اپریل ۲۰۰۲ء، ۳۶)

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے فیصلے عادلانہ ہوتے ہیں اور جس نے ظلم کو اپنے اوپر اور اپنے بندوں پر حرام قرار دیا ہے، کوئی سرزمین جس پر اس کے مالک جائز طریقے سے مسلسل قابض چلے آ رہے ہوں، ایک ایسے پردیسی گروہ کو عنایت کر دے جو وہاں باہر سے گھس آیا ہو؟ اللہ کا عدل و انصاف کہاں گیا؟ وہ تو انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اور ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' (ہفت روزہ الدعوۃ، الریاض، ۱۱ اپریل ۲۰۰۲ء، ۳۹)

علامہ اقبال نے اسی استدلال کی ترجمانی اپنے مشہور شعر میں یوں کی ہے:

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر کیوں نہیں حق اہل عرب کا

عالم اسلام کے اکابر و اصاغر اہل علم کے بیانات اور تحریروں میں جا بجا اسی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان میں مولانا مودودی کی تصانیف میں باہم متضاد باتیں درج ہیں۔ ارض موعودہ سے متعلق قرآن مجید کے نصوص کی تفسیر کرتے ہوئے تو ظاہر ہے، وہ اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکے، چنانچہ مثلاً سورۂ مائدہ کی آیت ۲۱ کے الفاظ 'الارض المقدسة التی کتب اللّٰہ لکم' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کا مسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ جا کر اسے فتح کرلو۔''
(تفہیم القرآن، ۱/۴۵۹)

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے۔ خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایما سے حضرت موسیٰ نے ان کو حکم دیا کہ ظالم کنعانیوں کو ارض فلسطین سے نکال دو اور اس علاقے کو فتح کرلو تو انھوں نے بزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔'' (۱/۱۸۴)

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۵ کے تحت فرماتے ہیں:

''حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں۔ حتی، اموری، کنعانی، فرزی، حوی، یبوسی، فلستی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا...... توراۃ میں حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو جو ہدایت دی گئی تھیں، ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی سرزمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔'' (۲/۵۹۶)

لیکن صیہونی تحریک کے دعووں اور عزائم کی تردید کرتے وقت یہ نصوص ان کی نگاہ سے بالکل اوجھل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائیبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور بائیبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتل عام کر کے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سرخ ہندیوں (Red Indians) کو فنا کر کے امریکہ پر قبضہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ ملک ان کی میراث میں دے دیا ہے اس لیے انھیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے، بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔...

اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ:

۱۔ یہودی ابتداءً نسل کشی (Genocide) کے مرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔

۲۔ شمالی فلسطین میں صرف چار پانچ سو برس تک وہ آباد رہے۔

۳۔ جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی۔ اور

۴۔ عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انھیں عطا فرمائی ہے اور انھیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندے کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل مسیح میں انھوں نے کیا تھا۔'' (سانحہ مسجد اقصیٰ، ۳۔۵)

اب ذرا ملاحظہ کیجیے کہ صحف آسمانی کی تصریحات اور امت مسلمہ کے موقف کے مابین تفاوت کس قدر ہے:

۱۔ صحف آسمانی ارض فلسطین کو خدا کی طرف سے یہود کو عطا کردہ میراث قرار دیتے ہیں، جبکہ ہمارے اہل علم ان کو اس سرزمین میں پردیسی اور اجنبی کہتے اور اس میں ان کے قیام کو صدیوں اور سالوں کے پیمانوں سے ناپ کر اس حق کو خرافات قرار دیتے ہیں۔

۲۔ صحف آسمانی اس سرزمین پر قبضے کے لیے بنی اسرائیل کی جنگ کو 'قتال فی سبیل اللّٰہ' قرار دیتے ہیں جو بنی اسرائیل نے سیدنا موسیٰ، سیدنا یوشع اور سیدنا داؤد علیہم السلام جیسے جلیل القدر انبیا کی زیر قیادت کیا، جبکہ ہمارے اہل علم نے اس ساری جدوجہد کے لیے 'نسل کشی' کا عنوان تجویز کیا ہے۔

۳۔ صحف آسمانی فلسطین کے سابق باسیوں یعنی کنعانیوں، فلستیوں اور دیگر اقوام کے وہاں سے اخراج کو ان کے جرائم کی پاداش اور فساد فی الارض کی سزا بتاتے ہیں، لیکن ہمارے اہل علم کے لیے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ خدا ایک سرزمین میں جائز طور پر بسنے والی قوم کو نکال کر ایک اجنبی قوم کو وہاں آباد ہونے کا حق کیسے دے سکتا ہے۔

۴۔ صحف آسمانی کے مطابق یہود کی اس سرزمین سے جلاوطنی ان کی بداعمالی کے نتیجے میں ہے اور اصلاح احوال کی صورت میں ان کی وہاں واپسی کا راستہ کھلا ہوا ہے، لیکن ہمارے اہل علم کے نزدیک ان کی واپسی کی کسی حال میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔

آج ہمارے مابین اس بات کا تذکرہ تو عام ہے کہ یہود ایک مغضوب علیہ قوم ہیں اور ان کی ذلت و رسوائی ان پر خدا کی طرف سے مسلط کردہ ہے، لیکن ہم اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان پر اللہ کا غضب اسی طرح کے کتمان حق، مذہبی و نسلی تعصب اور تکذیب آیات اللہ کے نتیجے میں نازل ہوا تھا جس کا مظاہرہ آج بعض معاملات، خاص طور پر یہود سے متعلق معاملات میں امت مسلمہ کر رہی ہے۔ جہاں تک اللہ کی رحمت اور اس کی ناراضی کے قانون کا تعلق ہے، قرآن مجید کی رو سے وہ امت مسلمہ کے لیے بھی وہی ہے جو بنی اسرائیل کے لیے تھا: 'ولن تجد لسنة اللّٰه تبديلا'۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس طرح کا غیر اخلاقی رویہ اختیار کرنے پر بنی اسرائیل پر تو اللہ تعالیٰ کی طرف ذلت و مسکنت مسلط کی جائے، لیکن امت مسلمہ کو بدستور عروج اور سرفرازی کے منصب پر فائز رکھا جائے؟

ریحان احمد یوسفی

مسلمان اور دنیا پرستی

(۱)

قارون سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا۔ بنی اسرائیل سے ہونے کے باوجود وہ فرعون کا ساتھی اور حضرت موسیٰ کا مخالف تھا۔ اس کی وجہ شہرت اس کی بے پناہ دولت تھی۔ مگر یہی دولت اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار کرنے کا سبب بن گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل قرآن یوں بیان کرتا ہے:

''یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا: پھول نہ جاؤ، اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا، جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو اس نے کہا: یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھے حاصل ہے... کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے؟ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔

ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے، وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے: کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، یہ بڑا نصیبے والا ہے، مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے: افسوس تمھارے حال پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اور یہ دولت نہیں ملتی، مگر صبر کرنے والوں کو۔

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ اب وہی لوگ جو کل اس کے مقام کی تمنا کر رہے تھے کہنے لگے: افسوس، ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے، کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس ہمیں یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد کرنا چاہتے ہیں۔ اور انجام کی بھلائی اللہ سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔'' (القصص ۲۸: ۷۶-۸۳)

قرآن کا یہ بیان کسی شرح و وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ یہ انسانوں کے دلوں میں پیوست دنیا پرستی کے جذبہ اور اس سے متعلقہ تمام معاملات پر انتہائی تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔ دنیا پرستی کا یہ مرض جو زمانۂ قدیم سے انسانوں کو خدا کی نافرمانی میں مبتلا کرتا رہا ہے، آج پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ ہمارے دلوں میں گھر کر چکا ہے۔ یہ مرض عام لوگوں کے لیے تو آخرت میں محرومی کا سبب ہے ہی، مگر مسلمانوں کے لیے تو اس دنیا میں بھی تباہ کن ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تاکہ ہم دنیا اور آخرت کے نقصان سے محفوظ رہ سکیں۔

انسانوں کے بارے میں خدا کا منصوبہ

اس مسئلہ پر گفتگو کے آغاز میں خدا کی اس حکمت کو واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے تحت اس نے یہ دنیا بنائی۔ قرآن کے مطابق یہ حکمت خدا کا وہ منصوبہ ہے جس کے مطابق خدا نے جنت کی ایک انتہائی خوب صورت اور حسین دنیا بنائی۔ یہ ایک ابدی بادشاہی ہے جو موت، غم، محرومی، مایوسی، تکلیف اور تکان کے ہر شائبہ سے خالی ہے۔ ہر وہ نعمت جس کا تصور کوئی ذی شعور کر سکتا ہے، اس میں رکھ دی گئی ہیں۔ عالی شان محلات، دل کش ازواج، مزاج شناس خدام، لذیذ غذائیں، پرکیف مشروبات، غرض انسان کے حواس جن نعمتوں کی طلب کر سکتے ہیں، انسان کا ذوق جمال جن چیزوں کی رغبت کر سکتا ہے اور انسان کے دل و دماغ جن خواہشات کی تسکین چاہتے ہیں، وہ سب اس جنت میں جمع ہیں۔

تاہم، اس ابدی جنت کی قیمت ایک امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ وہ امتحان یہ ہے کہ انسانوں کو اس دنیا میں چند سال اس طرح رہنا ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ اور قول و فعل کو علم و عمل اور اخلاق و کردار کی ہر آلایش سے بچا کر رکھے اور یہ ثابت کر دے کہ وہ خدا کی اس ابدی بادشاہت میں داخل ہونے کا مستحق ہے۔ اس امتحان میں ایک طرف اس کا نفس ہے جس میں حیوانی خواہشات کی نہ مٹنے والی بھوک ہے۔ دوسری طرف شیطان ترغیبات کی ختم نہ ہونے والی یلغار ہے۔ یہ دونوں اس کے وجود کو آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کو ان دونوں سے لڑ کر اپنے آپ کو پاکیزہ بنانا ہے۔ جو لوگ اپنے رب کے حضور اس طرح لوٹتے ہیں کہ ان کا وجود پاکیزہ اور ایمان و عمل صالح کے زیور سے آراستہ ہو، وہ خدا کی اس جنت میں داخلہ کے مستحق قرار پاتے ہیں جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ خدا کی نافرمانی میں لتھڑے ہوئے سرکشوں کا انجام، البتہ جہنم کی آگ ہوگا۔

ہم کون ہیں؟

خدا اس آزمایش کے عرصے میں انسانوں کے سامنے تو نہیں آتا، البتہ ان کی مدد اور رہنمائی کے لیے وہ اپنے پیغمبر بھیجتا رہا

ہے۔ یہ پیغمبر ہر دور میں ایمان و عمل صالح کی دعوت دے کر پاکیزگی حاصل کرنے کا انتہائی موثر راستہ انسانوں کے سامنے رکھتے رہے۔ مگر انسانوں نے ہمیشہ ان پیغمبروں کی تعلیمات کو فراموش کر کے علم و عمل کی آلائشوں سے خود کو آلودہ کر لیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ انسانوں کی مدد کے لیے ایک اور انتظام کیا جائے۔ وہ یہ کہ نبیوں کی رہنمائی میں ایک پوری امت اٹھائی جائے جو ایک گروہ کی شکل میں لوگوں کے سامنے حق کی گواہی دیتی رہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم کی نسل سے دو امتیں اٹھائیں۔ پہلی امت بنی اسرائیل تھے جو حضرت ابراہیم کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰق کے صاحب زادے حضرت یعقوب کی اولاد میں سے تھی۔ جبکہ دوسری امت آپ کے پہلوٹھی کے صاحب زادے حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے تھی اور بنی اسماعیل کہلائی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل میں مبعوث ہوئے۔ آپ آخری نبی تھے۔ ہم مسلمان آپ ہی کے امت میں سے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمان ہونا کسی فخر اور بڑائی کا معاملہ نہیں۔ نہ یہ جنت ہی میں جانے کی یقینی ضمانت ہے۔ یہ تو ایک ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ یہ ذمہ داری ایمان اور عمل صالح کی ہے۔ دراصل خدا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی شکل میں ایک گروہ دنیا میں موجود رہے جو ایمان و عمل صالح کی پیغمبرانہ دعوت کو عملی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا رہے۔ ہدایت جس طرح انفس و آفاق، عقل و فطرت اور صحف آسمانی کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے آتی ہے، اسی طرح ایمان و عمل صالح پر قائم ایک مسلم معاشرہ بھی لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کا سبب بنتا ہے۔ تاہم دنیا پرستی کا مرض جب کسی مسلم معاشرہ میں پھیل جاتا ہے تو یہ اسے ایمان و عمل صالح کا ایک حقیقی نقشہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ وہ مسلم معاشرہ ہی برائی اور شر کا محور بن جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث، دونوں میں مسلمانوں کو مال و دنیا کے اس فتنہ سے خبر دار کر دیا گیا تھا۔ اس سلسلے کی سب سے صریح روایت مسند احمد کی وہ حدیث ہے جس میں اس معاملے کو یوں بیان کیا گیا ہے: ''ہر امت کا ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آج کا دور کیا ہے؟

تاریخ بتاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور موجودہ دور میں دنیا پرستی کا یہ فتنہ اپنی انتہا پر پہنچ گیا ہے۔ عصر حاضر میں مال و دنیا، بلاشبہ سب سے بڑی قدر بن چکے ہیں۔ مذہب اور اہل مذہب لوگوں کو اس فتنہ سے کیا بچاتے، وہ خود اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ آخرت کی زندگی کا وہ تصور جسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے تمام نبی آئے اور دو عظیم امتیں اٹھائی گئیں، تمام انسانی معاشروں، بالخصوص مسلمانوں کے اندر سے رخصت ہو چکا ہے۔

اس صورت حال کا آغاز یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے عمل سے ہوا۔ چرچ کے جبر اور انتہا پسندانہ رویے کے خلاف جو ردعمل ہوا، اس کے نتیجے میں نہ صرف معاشرے پر اہل مذہب کی گرفت ختم ہو گئی، بلکہ خود مذہب اور مذہبی تصورات پر سوالات

اٹھائے جانے لگے۔ خدا، آخرت اور وحی جیسے بنیادی اور معقول مذہبی تصورات اسی طرح معاشرے میں غیر سائنسی قرار پائے جس طرح یہ عقیدہ سائنسی بنیادوں پر رد کیا گیا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے۔

دوسری طرف مغربی معاشروں میں فکر و عمل کی حریت، فرد کی آزادی اور ذوق حسن و جمال کا چلن عام ہو گیا۔ اس کے ساتھ صنعتی دور میں سائنسی ایجادات کی کثرت نے زندگی کو بے حد تیز، آسان اور خوب صورت بنا دیا۔ ریل، کار، بجلی، ٹیلی فون، سینما اور ان جیسی دیگر ایجادات نے اس دور کے انسان کو اپنا اسیر بنا لیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ حقیقت وہ نہیں جو مذہب ہمارے سامنے رکھتا ہے، بلکہ حقیقت صرف وہ ہے جو دنیا کی رنگینیوں کی صورت میں ہمیں نظر آ رہی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ سائنس اس کے ہر مسئلہ کو حل اور ہر مشکل کو دور کر سکتی ہے۔ وہ ناقابل علاج امراض میں شفا بن سکتی ہے۔ سردی کو گرمی اور گرمی کو سردی میں بدل سکتی ہے۔ اندھیرے کو روشنی اور غربت کو امارات میں تبدیل کر سکتی ہے۔ فاصلوں کو گھٹا سکتی اور انسانی قوت کو بڑھا سکتی ہے۔ غرض یہ کہ سائنس نے انسان کی ان تمام کمزوریوں کو دور کر دیا ہے جن کی بنا پر اسے مذہب کی ضرورت پڑتی تھی۔ مذہب تو ہم پرستی کے سوا کچھ نہیں جو زمانۂ قدیم کے ناواقف انسان نے اپنے دکھوں کی دوا کے طور پر ایجاد کر لیا تھا۔

ان حالات میں جب مذہب، خدا اور آخرت جیسے تصورات اپنی معنویت کھو چکے اور دنیا بہت رنگین و دلکش ہو گئی تو کیسے ممکن تھا کہ مغرب کا انسان دنیا پرست نہ بنتا۔ انیسویں صدی کا یہ دنیا پرست مغربی انسان صرف یورپ تک محدود نہ تھا، بلکہ اپنی سائنسی برتری کے بل بوتے پر پوری دنیا کا حاکم بھی بن چکا تھا۔ چنانچہ حاکموں کے اثرات محکوم اقوام پر پڑنے لگے۔ تاہم متعدد وجوہات کی بنا پر دنیا پرستی کی یہ یلغار مدھم پڑ گئی۔ جن میں مشرقی معاشروں کی روایت پسندی، ایک ایک فرد تک پہنچ کر اس کے ذہن کو مسخر کرنے والے میڈیا کی عدم موجودگی، دو عالمی جنگوں کے بعد مغربی قوت کی کمزوری، بیسویں صدی کی سائنسی دریافتوں کا اثباتِ مذہب وغیرہ نمایاں ہیں۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

اس عرصہ میں انکار مذہب سے متعلق اہل مغرب کی سوچ تو نہ بدلی، مگر اس میں ایک بنیادی تبدیلی آ گئی۔ دراصل مغربی معاشروں میں پیدا ہونے والے بعض مسائل خصوصاً دو جنگوں کی تباہ کاریوں نے مغربی انسان کے سائنس پر اعتقاد کو کمزور اور مذہب کی اہمیت و ضرورت کو اجاگر کر دیا۔ خود جدید سائنسی دریافتیں مذہبی تصورات کے حق میں دلائل فراہم کر رہی تھیں۔ پھر مذہب مخالف سوویت یونین سے مقابلہ کرنے اور کمیونزم کا زور توڑنے کے لیے مغربی اقوام نے مذہب کے فروغ ہی میں عافیت محسوس کی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں مذہب سے متعلق ان کا نقطۂ نظر بہت سخت نہ رہا۔ وہ اس کی آسمانی حیثیت تسلیم کرنے پر تو تیار نہ تھے، البتہ انھوں نے اسے معاشرتی زندگی کا ایک ناگزیر اور مفید جز مان لیا۔

چنانچہ عبادت گاہیں بننے لگیں لوگ بڑی تعداد میں مذہب سے دوبارہ وابستہ ہونے لگے۔ اہل مذہب کو معاشرے میں اہم مقام حاصل ہونا شروع ہوا۔ مقتدر طبقات مذہب کی اہمیت تسلیم کرنے لگے۔ لیکن مذہب کا یہ فروغ محض ایک ثقافتی مظہر کے طور پر تھا۔ مذہب کا اصلی مقصد یعنی آخرت کی کامیابی، اس نئے دور میں بالکل بھی پیشِ نظر نہ تھا۔ چنانچہ مقصد زندگی دنیا

پرستی ہی رہا اور مذہب بھی ایک اچھی دنیوی زندگی کا حصہ بن گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید انسان جب مادی تفریحات سے اکتا جائے تو اس کے لیے ایک روحانی تفریح بھی ہونی چاہیے۔ جن انسانوں کو مادی لذتوں میں سکون نہیں ملتا انھیں مذہب کی غیر مادی دنیا میں ایک جائے پناہ مل جائے۔ چنانچہ مغربی تہذیب میں فلم، موسیقی، سیر وتفریح، جنس اور شراب کی طرح مذہب بھی سکون حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ اس طرح دنیا پرستی کے خلاف یہ آخری ڈھال بھی باقی نہ رہی۔

دوسری یلغار

یہ حالات تھے کہ بیسویں صدی کے آخر میں، آج سے چند سال قبل، انسانی تاریخ نے ایک نیا موڑ کھایا۔ یہ انفارمیشن ایج کا آغاز تھا۔ جس کے نتیجے میں اہل مغرب کو ایک دفعہ پھر موقع ملا کہ وہ دوبارہ مشرقی اقوام پر یلغار کریں۔ تاہم اس یلغار کی نوعیت پہلی سے بہت مختلف تھی۔ پہلی دفعہ مغرب کا مادی غلبہ اور اقتدار دیکھ کر لوگوں کی اکثریت نے ان کی تہذیب وتمدن کے اکثر پہلووں سے لاتعلقی اختیار کی تھی، مگر اس دفعہ اہل مغرب خود نہیں آئے۔ ان کی تہذیب، تمدن، ثقافت، خیالات اور نظریات وغیرہ میڈیا کی رنگین شیشوں والی کھڑکی سے ہمارے گھروں میں داخل ہو رہے ہیں۔ پہلے ان کا واسطہ ہمارے خواص (Elite) سے پڑا تھا، مگر اب ہر خاص وعام تک ان کی پہنچ ہے۔ ہمارے ملک میں یہ یلغار صرف مغرب سے نہیں ہو رہی، بلکہ ہمارے پڑوس کی ہندو تہذیب اور اس کا میڈیا مغرب سے تہذیبی طور پر شکست کھانے کے بعد ان کے تصورات ہماری زبان میں ہماری عورتوں اور بچوں تک منتقل کر رہا ہے۔ اور اب تو ہماری اشرافیہ اور میڈیا کے لوگوں نے بھی خود کو اسی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔

دنیا پرستی اور ہمارا معاشرہ

ان حالات میں ہمارا معاشرہ مکمل طور پر دنیا پرستی کی اس موجودہ یلغار کا شکار ہو چکا ہے۔ مذہب کی وہ قوت جس نے پچھلی دفعہ ہمارا دفاع کیا تھا، اس دفعہ موثر ثابت نہیں ہو سکی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رائج مغربی نظریات انکار مذہب پر نہیں کھڑے، بلکہ ان میں مذہب کو بھی دنیا پرستی کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ لوگ مذہب کو ایک تہذیبی ورثہ اور رسوم وعادات کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ ایسا مذہب انسانوں کو نہیں بدلتا، بلکہ وہ انسانوں کے ماحول، مزاج اور عادات کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس قابل نہیں رہتا کہ انسانوں کو دنیا پرستی سے روک سکے۔ ٹھیک یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا اور اسلام کے تمام تر دعووں کے باوجود ہمارے ہاں دنیا پرستی کا مرض خوب پھلا پھولا۔ اس کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے ان میں سے چند کی تفصیل اب ہم بیان کریں گے۔

[جاری]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد بلال

ایک بندۂ مومن کی رحلت

یکم اگست ۲۰۰۳ کو علم حدیث کے ایک بڑے عالم حافظ عطاء الرحمٰن وفات پا گئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات بلند کرے۔

حافظ صاحب پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے بھیرہ میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ مقامی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ خاندان کا تعلق بریلوی مکتب فکر کے ساتھ تھا۔ قرآن مجید کا ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے پڑھا۔ مزید علم حاصل کرنے کے لیے ایک دیوبند استاد مولانا عبدالرشید کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے مدرسے میں آخری سال میں تھے کہ اہل حدیث مکتب فکر کی طرف راغب ہو گئے۔ اس دوران میں دیوبند مکتب فکر کے مدرسے سے سند حاصل کی۔ خاندان کی بھرپور مخالفت کے باوجود جس راہ کو درست سمجھا، اس پر چلتے رہے۔ جامعہ محمدیہ، گوجرانوالہ میں حافظ محمد گوندھلوی سے تعلیم حاصل کی اور سند فراغت حاصل کی۔

اہلیہ کی وفات کے بعد اپنے اہل وعیال کو لے کر مستقل طور پر لاہور میں اقامت پزیر ہو گئے۔ ان کے اندر دین کی طلب کا غیر معمولی ذوق تھا۔ انھوں نے اپنی تمام عمر دین کے ایک سچے طالب علم کی حیثیت سے گزار دی۔ علم اور علما کے بے حد قدر دان تھے۔ ساری زندگی پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہے۔ بہت سے لوگوں کو قرآن وحدیث کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ جہلا کی مجالس میں بیٹھنے سے اجتناب کرتے اور علما کی مجالس میں بیٹھ کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ اللہ کی خاطر محبت کرتے اور اللہ ہی کی خاطر بغض رکھتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ماہانہ گھریلو بجٹ سے کچھ رقم مخصوص کر لیتے تھے۔ پھر چند ماہ بعد مطلوبہ کتاب خرید لیتے اور دن رات اسی کا مطالعہ میں مصروف رہتے۔ علم کے تجسس اور مطالعہ کے شوق کے باعث ان کے پاس کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ روزانہ بہت دیر تک مطالعہ کرتے تھے۔ پھر خوشی سے گھر کے کسی فرد کو بتاتے کہ میں نے آج اتنا پڑھا ہے۔ جب تک صحت نے اجازت دی مختلف علما کی نشستوں میں شریک ہوتے رہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جس پس منظر میں ان کی پرورش ہوئی، اس میں کچھ مخصوص نقطہ ہائے نظر ہی تھے جن کو اصل دین سمجھا جاتا تھا۔ مگر جیسے جیسے ان پر حقائق واضح ہوتے گئے، وہ پرانی بات چھوڑتے گئے اور اتنی بات کو اپناتے گئے۔ ایک زمانے میں وہ شرک و بدعت کے معاملے میں غیر معمولی طور پر حساس تھے۔ حتیٰ کہ وہ جمعہ کی نماز بھی کسی کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے، بلکہ اس نماز کا الگ سے اہتمام کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بہت سے لوگ جو جمعہ کی نماز پڑھ یا پڑھاتے ہیں، وہ شرک و بدعت میں ملوث ہیں، مگر آہستہ آہستہ ان کے ہاں اس معاملے میں اعتدال آ گیا۔

وہ علم حدیث کے ایک بڑے عالم تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ تمام احادیث کی اسناد پر نظر ثانی کریں۔ اس غرض سے انھوں نے بخاری و مسلم پر کچھ کام کیا۔ طویل عرصے تک وہ احادیث کے رجال پر کام کرتے رہے۔ موطا امام مالک پر ان کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ وہ عربی زبان کے ایک بڑے عالم تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ کام عربی زبان میں کیا۔ آخری دنوں میں ان کے زیر مطالعہ مسند احمد تھی۔

علمی اعتبار سے انھوں نے عوام الناس کی بہت خدمت کی۔ کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو جب تک اچھی طرح تحقیق نہ کر لیتے مطمئن نہ ہوتے۔ حدیث بیان کرنے سے پہلے اس کی صحت کی پڑتال کرتے۔ اگر کوئی شخص کسی مسئلہ کی بابت پوچھتا تو فوراً اس مسئلے کا حل نہ بتا دیتے، بلکہ اس کا حل تحریری طور پر دینے کا وعدہ کرتے اور جب جواب دیتے تو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ دلائل دیتے تاکہ مسئلہ جاننے والا قائل ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد نرینہ سے محروم رکھا۔ اپنے دامادوں کے بارے میں ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ قرآن و حدیث کو سمجھنے والے ہوں۔

ان کی شخصیت کا اصل حسن ان کا تقویٰ تھا۔ جس چیز کو وہ دین سمجھتے تھے، اس معاملے میں آخری درجے میں عمل کیا کرتے تھے۔ اللہ نے انھیں بڑی سخت اور طویل آزمایشوں میں مبتلا کیا۔ روزگار کے لیے رحمان پورہ میں جنرل اسٹور بھی بنایا۔ مالی طور پر بہت تنگ دست تھے۔ ان کی اہلیہ بڑے طویل عرصے تک بیمار رہیں۔ ان کی پانچ بچیاں تھیں۔ ان کی پرورش اور تعلیم کے مسائل سے دوچار رہے۔ وہ کام جو وہ کرنا چاہتے تھے، اس کی ہمارے ہاں پزیرائی نہیں تھی۔ کوئی آدمی ان کے کام کی قدر کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے باوجود کبھی ان کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی۔ کوئی شکوہ نہیں سنا، بلکہ اس کے برعکس انفاق کا یہ معاملہ تھا کہ کسی مہینے مثال کے طور پر دو ہزار روپے میسر ہوئے تو ایک ہزار روپیہ انفاق کر دیتے۔ انفاق فی سبیل اللہ پر خود بھی عمل پیرا تھے اور لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک ڈبا بنایا ہوا تھا جس کو وہ بیت المال کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس میں صدقات وغیرہ ڈالتے رہتے تھے اور مہینے کے بعد غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ کبھی دینوی چیزوں یا ضرورتوں کو دیکھتے یا ذکر کیا جاتا تو کہتے: یہ سب کچھ آخرت میں ہمیں ملے گا۔ دنیا میں ہمارے لیے کچھ نہیں ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ لمبے لمبے منصوبے بنا کر کیا کرنا ہے!

اگرچہ خود بہت خوش حال نہ تھے، مگر صدقہ دینا انھیں بہت پسند تھا۔ کوئی کام اٹکا ہوتا، بیماری یا مشکل ہوتی تو فوراً صدقہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دیتے۔ انفاق ہی کے ذریعے سے ہر مشکل کا حل نکالتے۔ اکثر یہ حدیث قدسی بیان کرتے کہ فرشتوں سے اللہ تعالیٰ کا مکالمہ ہوا کہ پہاڑ، لوہا، آگ، پانی ہوا سے طاقت ور مومن کا وہ صدقہ ہے جو وہ دائیں ہاتھ سے کرے اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ اس حدیث کی وضاحت یوں فرماتے کہ اگر آپ پر پہاڑ جیسی کوئی مشکل آ گئی ہے تو صدقہ کریں۔ اگر لوہے جیسے کوئی مصیبت ہے تب بھی صدقہ سے ٹالیں۔ آگ جیسی کوئی مشکل آڑے آ گئی ہے تو صدقہ کریں۔ پانی اور ہوا کے مثل کوئی ناگہانی صورت پیدا ہو گئی ہے تو صدقہ سے مدد حاصل کریں۔ کیونکہ سب سے طاقت ور صدقہ ہے۔ خود اس عمل میں اتنا آگے جا چکے تھے کہ اپنی آمدنی سے ۳۳ فی صد انفاق کرتے اور خواہش ظاہر کرتے کہ اسے ۵۰ فیصد تک لے جاؤں۔ کبھی اصل تنخواہ کے علاوہ کوئی شاگرد خدمت کرتا تو وہ ساری کی ساری رقم اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیتے اور کہا کرتے: میں نے بینک بیلنس بنایا ہوا ہے اور میرا بینک ایسا ہے جہاں سات سو گنا سے زیادہ منافع کی امید ہے۔ کبھی کسی مادی چیز کی خواہش کا اظہار نہ کرتے۔ صرف عید پر نئے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ اس کے علاوہ کسی خاص مقصد کے لیے بھی کوئی پیسہ جمع نہ کرتے، کبھی اصرار کیا جاتا تو کہتے کہ میں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی ہے۔ دنیا کے معاملات بھی میں نے اللہ کے سپرد کر دیے ہیں۔ وہ خود کارساز ہے۔

سال کے تمام مہینوں میں سے رمضان میں زکوٰۃ دینے کی تلقین کرتے اور کہتے: رمضان میں اگر ستائیسویں شب کو زکوٰۃ اور صدقات کا اہتمام کیا جائے تو بہت ثواب کا کام ہے اور خود بھی اسی پر عمل پیرا ہوتے۔

خوفِ الٰہی اس قدر تھا کہ تندرستی میں تو استغفار کرتے ہی تھے، سخت بیماری میں بھی بہت روتے تھے۔ وفات سے تقریباً ایک ماہ پہلے اونچی آواز سے رویا کرتے تھے۔ اس کی وجہ پوچھنے پر اصرار کیا جاتا تو ایک دن کہنے لگے: یہ میرا آخری وقت ہے۔ میرے پاس کوئی عمل نہیں۔ میں اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مجھے جہنم اور عذاب قبر سے ڈر لگتا ہے۔ دماغی حالت بگڑ جانے کے باوجود نماز، قرآن اور حدیث کا ذکر کرتے رہتے۔ ہر وقت یہی کہتے: فلاں بات قرآن و حدیث میں ہے۔ میں نے نماز پڑھنی ہے۔ مجھے نماز پڑھنے دیں اور بغیر وضو کیے جس کی طرف چہرہ ہوتا جہاں کھڑے ہوتے، خیال کرتے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ نسیان نے سب کچھ بھلا دیا تھا، لیکن قرآن پھر بھی یاد تھا۔ تصوف سے سخت بے زار تھے۔ شاعری میں چونکہ صوفیانہ رنگ زیادہ جھلکتا ہے، اس لیے اس سے اکثر گریز ہی کرتے۔

بیت اللہ سے وابستگی اس قدر تھی کہ دعا کیا کرتے تھے کہ یا اللہ مجھے حج کی سعادت نصیب فرما اور وہیں کا مقیم بنا دے۔ بیت اللہ کا جب بھی خیال آتا کہتے: میرا اصل گھر بیت اللہ ہے، لیکن مجھے میرے گھر سے دور کر دیا گیا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ یا اللہ، حافظ صاحب کو جنت کا مقیم بنا دے۔ انھیں اپنا قرب عطا فرما دے۔ جن اخروی نعمتوں کے لیے انھوں نے دنیا کے دکھ جھیلے، اب ان کے لیے ابدی راحتوں کا اہتمام کر دے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

—— جاوید

O

یہ نغمہ دردِ فرقت سے نوائے غم ہوا آخر
یہی فرقت کا رشتہ ، رشتۂ محکم ہوا آخر

مہ و انجم سے روشن تھا کبھی اپنا یہ میخانہ
وہ اس کا غلغلہ اب گریۂ پیہم ہوا آخر

یہی آدم ہوا ہے باعث تخلیق آدم بھی
یہ افسانہ بھی جزوِ قصۂ آدم ہوا آخر

سنا ہے اب کہیں ابلیس بھی صدیوں کی محنت سے
فرنگی بت گروں کے راز کا محرم ہوا آخر

صدا آئی یہ دین حق جب اترا آسمانوں سے
جہاں میں اختلاطِ شعلہ و شبنم ہوا آخر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہی گھر تھے جہاں کچھ روح مشرق دیکھ لیتے تھے
یہ شیرازہ بھی اِس تہذیب میں برہم ہوا آخر

اسی دل سے فروزاں تھے زمین و آسماں لیکن
وہ ظلمت ہے کہ اس کا نور بھی مدھم ہوا آخر

ترے حرف عنایت سے میں بے گانہ رہا برسوں
مرے زخمِ جگر پر اب وہی مرہم ہوا آخر

تعجب ہے زمیں کو ، آسماں بھی محوِ حیرت ہے
وہ اک اُمی تھا ، لیکن سرورِ عالم ہوا آخر

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org